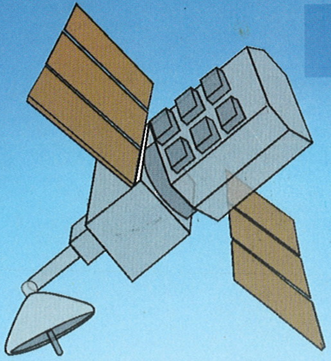
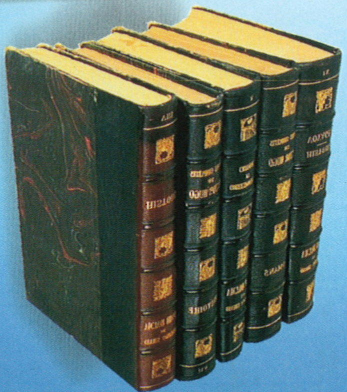


نشریاتِ مدنی



ڈاکٹر مولانا محمد صدرالحسن ندوی مدنی





نشریاتِ مدنی

NASHRIAAT-E-MADNI

ڈاکٹر مولانا محمد صدرالحسن ندوی مدنی



NASHRIAAT —E— MADNI

Dr. Md. Sadrul Hasan Nadvi Madni
(M.A. Ph.D.)

A. Basit, (DigitalFair)0240-3119200

سلسله مطبوعات معهد الدراسات الاسلاميه............ ۳۲

نشریات مدنی

(آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد مہاراشٹر سے نشر شدہ تقاریر کا مجموعہ)

ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی

ملتزم الطبع و النشر
معهد الدراسات الاسلامية
دار السلام ٦٣/ عارف كالونى، أورنج آباد- ٤٣١٠٠١- مهاراشتر (الهند)
١٤٢٤هـ - ٢٠٠٣م
وجد میموریل ٹرسٹ اورنگ آباد کے جزوی مالی تعاون سے شائع شدہ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	نشریات مدنی
تالیف	:	ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی
سن اشاعت	:	ربیع الآخر ۱۴۲۵ھ مطابق مئی ۲۰۰۴ء
قیمت:	:	Rs.75/-
زیر اہتمام	:	مولانا محمد اعجاز ندوی
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	ساجد نقوی برائٹ ایڈورٹائزرس اورنگ آباد موبائل:9850018321
مطبع	:	سویرا آفسیٹ پریس، بھڑکل گیٹ، اورنگ آباد

ملتزم الطبع و النشر

معهد الدراسات الاسلامية

''دارالسلام'' ۶۳/عارف کالونی، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱۔ مہاراشٹر (الہند)

ملنے کا پتہ

شالیمار کتاب گھر
روشن گیٹ، اورنگ آباد

ندوی کتاب گھر
نزد گلاب مسجد، عنایت نگر، پربھنی

مکتبہ اسلامی
نظام الدین چوک، شاہ گنج، اورنگ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخن ہائے گفتنی

ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام الأتمان الأكملان على محمد بن عبدالله الامين وعلى اله و صحبه اجمعين ، اما بعد :

زمانی اعتبار سے پندرہ سال پر محیط نشر گاہ اورنگ آباد خجستہ بنیاد سے شخصیات، مذہب وادب اور معاشرتی موضوعات پر نشر شدہ تقاریر کا یہ گلدستہ گل ہائے رنگ رنگ کا ایک حسین مرقع ہے۔ وقت کی محدودیت اشہب قلم کے لئے ہمیشہ عناں گیر رہی کیونکہ نشر گاہ کی روایت کی پاسداری جزو ایمان نہ سہی جزو قلم تو ضرور ہے۔ سامعین کی جانب سے تقاریر کی پذیرائی اور خطوط کے ذریعہ اس کا اظہار میرے لئے وجہ دل بستگی ہے۔ یہ بات بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ ہندوستان کی دوسری نشر گاہوں نے بھی بعض تقاریر کو بہ نظر استحسان دیکھا اور انہیں نشر کر کے اپنی علم دوستی اور خورد نوازی کا ثبوت دیا۔

فضائے گردوں میں بکھری ہوئی ان ہی گریز پا صداؤں کو میں نے اس کتاب

میں مقید کرنے کی ناتمام کوشش کی ہے۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

میرے کرم فرما اور میرے اور سبھوں کے لئے قابل احترام اور علاقہ کی ہر دلعزیز شخصیت ڈاکٹر مظہر محی الدین صاحب نے پیش لفظ تحریر فرما کر اس ہیچ مداں کی جس طرح ہمت افزائی فرمائی ہے اس پر میں ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔

محبّ گرامی قدر ڈاکٹر ثاقب انور ثاقبؔ نے اپنی علالت، علمی مشغولیت اور طبع موزوں کی مصروفیت کے باوجود تقریظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی اور کمپوز شدہ مضامین پر دقّتِ نظر سے نظرثانی کی اور مفید مشوروں سے نوازا، بہ صمیم قلب میں ان کا مشکور ہوں۔

خانوادۂ جبّہ و دستار کے چشم و چراغ، ممتاز صاحب طرز انشاء پرداز، گلستان ادب کے گل سرسبد، دُھن کے پکے اور قلم کے دھنی محبّ گرامی نورالحسنین صاحب نے اپنے مجموعہ مضامین کا سرنامہ ''یادگار تحریریں'' سہواً میرے مجموعۂ تقاریر پر چسپاں کردیا ہے، اس دانستہ سہو پر ان پر سجدہ سہو لازم ہے اور بارگاہ خداوندی میں مجھ پر سجدۂ شکر۔ ان کی خدمت میں بھی گلدستہ تسلیمات اور ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں سہواً نہیں عمداً۔

عتاب آمیز محبت وشفقت یا شفقت آمیز عتاب کے ذریعہ اپنی اصول پسندی کا خراج وصول کرنے والے میرے مخلص دوست اور شعبہ اردو کے سیاہ وسفید کے مالک

جناب باقر عسکری کا شکریہ بہ زبان وقلم اور بہ قلب نظر ادا کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کتاب کی وجود پذیری میں ان کی نظر عنایت، نگاہ انتخاب اور نگہ التفات کو بڑا دخل ہے۔ اس موقعہ پر نشر گاہ (آکاش وانی) اورنگ آباد کی ممنونیت کا اظہار بھی ایک امر واقعی ہے۔

عزیزان محمد اعجاز ندوی اور ساجد نقوی نے اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور تصحیح میں جو ناقابل دید مشقت برداشت کی، اللہ ان کو اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

آخیر میں دست بہ دعا ہوں کہ اے فضائے بے کراں کو وجود بخشنے والے اس کتاب کی نافعیت کو بے کراں کردے اور اس مجموعہ کو اپنی خوشنودی کا ذریعہ بنا کر ''قلعی کھولنے والے دن'' اس کم سواد کے ساتھ ستاری کا معاملہ فرما۔

وما لی حیلة الا رجائی — بعفوك ان عفوت و حسن ظنی
یظن الناس بی خیراً و انی — لشر الناس ان لم تعف عنی

وآخر دعوٰنا ان الحمد لله رب العٰلمین۔

ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی
''دارالسلام''، ۶۳/عارف کالونی،
اورنگ آباد (مہاراشٹر)

۱۱/ربیع الآخر ۱۴۲۵ھ
مطابق ۳۱/مئی ۲۰۰۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ڈاکٹر مظہر محی الدین
(سکریٹری مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ، اورنگ آباد)

ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی کے قلم سے نکلی ہوئی نگارشات کو اکثر پڑھنے اور سننے کا موقع ملا ہے۔ ان مضامین کا مجموعہ نظر کے سامنے ہے۔ یہ کتاب ان تقاریر کے مجموعہ پر مشتمل ہے جو آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد سے نشر ہوئیں اور بہت مقبول بھی ہوئیں۔ ان کی مقبولیت کا سبب صرف نفس مضمون نہیں بلکہ مولانا کا دلکش انداز بیان بھی ایک سبب ہے۔ اس دلکشی کی وجہ سے پڑھنے والوں کی دلچسپی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ برمحل اشعار کا استعمال بھی اس دلکشی کا ایک سبب ہے۔ یہ کتاب مولانا کے بائیس مقالات پر مشتمل ہے۔

جن موضوعات پر مولانا نے قلم اٹھایا ہے وہ تاریخی اعتبار سے بھی اہم ہیں اور سماجی اعتبار سے بھی۔ ان کی روشنی میں انسان آج بھی اپنی زندگی سنوار سکتا ہے۔ محبت اور اخوت کے پیغام کے ذریعے اس دنیا کو انسانوں کے رہنے کے لئے ایک بہتر جگہ بنا سکتا ہے یعنی ایک ارضی جنت بنا سکتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

حضرت امام حسنؓ کے متعلق مولانا لکھتے ہیں ”قوت وسطوت، سرفروشوں، جاں نثاروں اور جواں مردوں کے جم غفیر کی موجودگی میں حضرت حسنؓ کے لئے شامی فوج سے

نبرد آزما ہونا اگر آسان نہین تو کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ لیکن جنگ کی ہولناکی کے مشاہدات آپ کے سامنے تھے۔ آپ کے دلِ دردمند سے ایک آواز نکلی کہ اس جنگ کے نتائج بڑے بھیانک ہونگے اور اس کے لئے بہت بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔ خون کی ندیاں ہونگی اور لاشہ مسلم کا انبار ہوگا“۔

مولانا لکھ سکتے تھے کہ حضرت حسنؓ بہت آسانی سے فتح پا سکتے تھے لیکن ایک سچے مورخ کا یہ فرض ہوتا ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں احتیاط سے کام لے۔ مولانا نے اس احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ حضرت معاویہؓ کے بارے میں مولانا محمد صدر الحسن ندوی کی یہ تحریر ملاحظہ ہو۔

”حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ہی سے حضرت معاویہؓ کے دل میں شام کے علاوہ جس کے وہ گورنر تھے پورے عالم اسلام کی تولیت کی تمنا بھی تھی۔ حضرت امام حسنؓ کی امن پسندی، صبر وتحمل اور ان کی صلح جویانہ طبیعت سے حضرت معاویہؓ اچھی طرح واقف تھے“۔

اسی طرح حضرت حسینؓ کے اسوہ مبارک کے بارے میں اپنے مقالے ”کربلا آج بھی درس عمل دیتی ہے“ میں بہت ہی موثر انداز میں تاریخی واقعات اور کربلا کے غم انگیز حالات کو قلم بند کیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حُسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیل

یہ داستان واقعی سادہ بھی ہے اور مسلمانوں کے خون سے رنگین بھی۔ اللہ تعالیٰ نے تو کمال مہربانی سے حضرت اسمٰعیل کی جاں بخش دی لیکن حضرت حسینؓ کا واسطہ انسانوں سے تھا۔ وہ بھی ایسے انسان سے تھا جس کے بارے میں مولانا صدر الحسن لکھتے ہیں کہ کربلا میں

''شقی القلب، ناعاقبت اندیش، بدبخت کم نصیب سفان بن انیس نے جگر گوشہ رسول کا سرتن سے جدا کردیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون''۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاک کردار پر بھی بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اس مقالے کا عنوان ہی ''ام المومنین حضرت عائشہؓ ایک مثالی خاتون ہے۔

مولانا محمد صدرالحسن نے حضرت عثمان کی شہادت کے واقعہ کو جس دلدوز انداز میں بیان کیا ہے وہ بہت ہی اثر آفرین اور متاثر کن ہے، جسے پڑھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اس مقالے میں اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ بہت اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ حضرت عثمانؓ کے پاکیزہ کردار کی تصویر بھی بہت خوبصورت انداز میں ابھرتی ہے۔

حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت امام حسین کی شہادت سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑ گیا جو آگے چل کر خانہ جنگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ خانہ جنگی بعد میں بھی جاری رہی۔ مسلمانوں کی اسی خانہ جنگی کی وجہ سے نہ صرف تسخیر یورپ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا بلکہ اندلس (اسپین) پر قبضہ برقرار رکھنا بھی دشوار ہو گیا اور وہاں سے انہیں بہت ہی کسمپرسی کی حالت میں نکلنا پڑا۔ اگر مسلمان متحد ہوتے تو ان کی مشترکہ طاقت اسپین کے حکمراں فرڈینڈ کے ارادوں کو خاک میں ملا سکتی تھی اور وہ یوں مسلمانوں کو ملک بدر کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا۔

مولانا نے ''مقدس کتابوں کی روشنی میں تعلیم کی اہمیت، مقدس کتابوں کی روشنی میں خواتین کے ساتھ سلوک، مقدس کتابوں کی روشنی میں راست گوئی اور رہنمائی، مقدس کتابوں کی روشنی میں معاشرتی اخلاق'' وغیرہ پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ان کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا مختلف مذاہب کی تعلیمات کا مطالعہ کس قدر وسیع ہے۔

''حضرت مریم۔ ایک عظیم خاتون'' میں نہ صرف حضرت مریم کی پاکیزہ زندگی پر

روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ان کے خاندان سے متعلق بھی بے بہا معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ان تمام مضامین کا نچوڑ بھی مولانا ہی سے سنیئے۔

''معاشرتی اخلاق کی ہر زمانے میں ضرورت رہی ہے کیونکہ وہی مرض کی دوا اور زہر کا تریاق بھی ہے۔ آج جبکہ اخلاقی قدریں موت وزیست کی کشمکش سے دوچار ہیں ضرورت ہے کہ شمع اخلاق کی لو تیز ہی نہیں تیز تر کی جائے تاکہ معاشرے کو نئی روشنی، نئی تابانی اور استحکام نصیب ہو اور پُرسکون معاشرہ میں ہر فرد چین کی زندگی گذارے''۔

یہ کتاب ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں تمام عکس اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔

ڈاکٹر مظہر محی الدین

۴؍مئی ۲۰۰۴ء، اورنگ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

ڈاکٹر ثاقب انور
(سابق صدر شعبہ انگریزی، مولانا آزاد کالج، اورنگ آباد)

الحمدللہ میرے لئے یہ امر باعث صد افتخار وتشکر ہے کہ میرے مخلص اور محترم دوست ڈاکٹر مولانا محمد صدرالحسن ندوی مدنی، ایم اے، پی ایچ ڈی (علیگ) کی نشر شدہ تقاریر کا مجموعہ نشریات مدنی کے نام سے اشاعت پذیر ہونے جا رہا ہے۔ یہ تقاریر ۹ رستمبر ۱۹۹۱ء سے لیکر ۲ر مارچ ۲۰۰۴ء کے دوران وقفے وقفے سے نشر ہوتی رہیں۔ ۱۲ رسال ۸ر ماہ پر محیط اس طویل عرصے میں مولانا نے مختلف دینی، علمی، ادبی اور تنقیدی پہلوؤں پر اپنی جامع اور عالمانہ بصارت اور بصیرت کی حامل ان تقاریر کے ذریعے نہ صرف سامعین کی معلومات میں بے بہا اضافہ فرمایا بلکہ ان کے ذوق کی تزئین وآرائش بھی فرمائی۔ ان تقاریر کی جملہ تعداد ۲۲ ر ہے۔

تادم تحریر مولانا کے اردو اور عربی مضامین جو برصغیر ہندو پاک کے موقر علمی اور ادبی جریدوں میں زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں ان کی تعداد (۲۶۹) ہے۔ جن جریدوں، رسالوں، ہفتہ وار اور روزناموں میں آپ کی تخلیقات شائع ہوئیں ان میں سے چند کے نام اس طرح ہیں۔: (۱) تعمیر حیات لکھنو (۲) معارف، اعظم گڑھ (۳) جریدہ الرائد، لکھنو (۴) البعث الاسلامی، لکھنو (۵) فاران، کراچی (۶) ترجمان الحق، کشمیر (۷) ندائے ملت، لکھنو (۸) مجلۃ الارشاد، یمن (۹) مجلّہ نور السلام، نیپال (۱۰) الصبح الجدید، بنگلہ دیش (۱۱) اورنگ آباد ٹائمز، اورنگ آباد (۱۲) گلشن (پندرہ روزہ، مالیگاؤں) (۱۳) حقیقی اظہار،

اورنگ آباد (۱۴) روزنامہ ڈان، اورنگ آباد (۱۵) روزنامہ رہبر، اورنگ آباد (۱۶) سہ ماہی صفا، حیدرآباد (۱۷) منشور کاشف، اورنگ آباد (۱۸) مجلّہ فقہ اسلامی، دہلی (۱۹) صوت السلا، حیدرآباد (۲۰) روح قرآن، حیدرآباد (۲۱) ماہنامہ ہدایت، جے پور (۲۲) سہ ماہی کاروان ادب، لکھنو (۲۳) الحسنات، رامپور (۲۴) روزنامہ آبشار، کلکتہ (۲۵) روزنامہ مقدس، اورنگ آباد (۲۶) قومی محاذ، اورنگ آباد (۲۷) مجلّہ ماہ صیام، اورنگ آباد (۲۸) ڈلرس میگزین، وجد میموریل ٹرسٹ، اورنگ آباد۔

ان ۲۶۹ رمضامین کے علاوہ مولانا کے قلم عطاردِ رقم سے اب تک حسب ذیل ۲۹ کتابیں اردو، انگریزی، عربی اور ہندی میں تخلیق پا کر زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

(۱) خود پرستی یا خدا پرستی (اردو) (۲) اورنگ زیب اور تدوین فتاوی عالمگیری (اردو) (۳) اصلاحِ معاشرہ (اردو) (۴) زلزلہ اسباب اور علاج (اردو) (۵) اجتہاد اہمیت اور ضرورت (اردو) (۶) فقہ اسلامی اور مستشرقین (اردو) (۷) زکوٰۃ کس طرح ادا کریں (اردو) (۸) والدین اور اولاد کے حقوق (اردو) (۹) شریعت کا مذاق کب تک (اردو) (۱۰) راہ نجات (اردو) (۱۱) آئینہ تاریخ ادب عربی (اردو) (۱۲) مسائل جنازہ (اردو) (۱۳) تحفہ رمضان (اردو) (۱۴) جمعہ فضائل، آداب، احکام، مسائل (اردو) (۱۵) المستشرقون والاسلام (عربی) (۱۶) الاسلام والمسلمون فی الھند (عربی) (۱۷) الفرائد فی الفرائض (عربی) (۱۸) المستشرقون والفقہ الاسلامی (عربی) (۱۹) الامبریالیۃ الغربیۃ تھدد المسلمین (عربی) (۲۰) زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟ (ہندی) (۲۱) رائٹس آف پیرنٹس اینڈ چلڈرن (انگریزی) (۲۲) انشاء اور ترجمہ میں مہارت کس طرح پیدا کریں؟ (اردو) (۲۳) ابو ہریرہ الصحابی المظلوم والمفتری علیہ (عربی) (۲۴) المستشرقون وتعدد زوجات النبی ﷺ

(عربی) (۲۵) منافذ الحضارۃ الاسلامیۃ الی اوربا قبل عصر النہضۃ (عربی) (۲۶) دینی اور عصری تعلیم وقت کی ایک اہم ضرورت (اردو) (۲۷) رویت ہلال (اردو) (۲۸) اسلام میں عورتوں کے معاشی حقوق (اردو) (۲۹) الاسلام والمستشرقون (عربی)۔

مولانا کی پیدائش ۱۵ رفروری ۱۹۵۷ء ہے۔ آپ نے بہار مدرسہ ایکزامینیشن بورڈ سے وسطانیہ، فوقانیہ اور مولوی کی سند حاصل کی، اس کے بعد ۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۴ء ڈی ایڈ (Teacher's Training Course) کی تکمیل کی۔ ۱۹۷۵ء میں عالم اسلام کی مشہور دینی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں عالمیت اور ۱۹۸۰ء میں فضیلت کی سند امتیازی نشانات سے حاصل کی۔ آپ ڈیوبند سے کامل اور ماہر کے امتحان بھی درجہ اول سے کامیاب ہوئے۔ ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۵ء آپ عالم اسلام کی مشہور یونیورسٹی الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ (سعودی عرب) اعلیٰ تعلیم کے لئے تشریف لے گئے وہاں آپ کو جامعہ کی عالیہ کی سند کے ساتھ ساتھ الطالب المثالی کی سند سے بھی نوازا گیا۔ آپ نے ۱۹۹۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی زبان میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تین سال کے بعد ۱۹۹۸ء اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ نے اپنی ریسرچ کے موضوع کے طور پر ان نعت گو شعراء کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا جنہوں نے ہندی نژاد ہونے کے باجود آقائے تاجدار رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں عربی زبان میں نعتیں کہی ہیں، جنہیں دنیا بھر میں عام مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور عالم عرب کے دانشوروں نے بھی جن کی اثر انگیزی اور لسانی اکملیت کا کھل کر اعتراف کیا۔ مثال کے طور پر دکن کے شاعر عشقی کی زبان زد خاص عام نعت ''یا شفیع الوریٰ سلام علیک یا نبی الہدیٰ سلام علیک'' کا حوالہ دینا ہی کافی ہے۔ مولانا نے ایک ہزار چالیس صفحات پر مشتمل دو جلدوں پر مبسوط

تحقیقی مقالہ عربی زبان میں ہی تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا نے ۱۹۹۹ء میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (U.G.C.) کا نیٹ امتحان بھی پاس کیا۔ اورنگ آباد مرکز علوم شرعیہ نے مولانا کو ان کی تحقیقات وعربی تالیفات کی گرانقدر خدمات کو سراہتے ہوئے ''مثالی عالم'' کے خطاب سے نوازا ہے۔

مولانا نے یونیورسٹی سطح پر توسیعی خدمات (Extension Services) میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ بابا صاحب امیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد میں عربی زبان کے انڈر گریجویٹ (U.G.) اور پوسٹ گریجویٹ (P.G) سطح کے سوالیہ پرچہ نگاروں (Paper Setter) میں شامل رہے ہیں۔ آپ BAMU کے (U.G.) اور (P.G.) سطح پر عربی کے ممتحن اور Moderator رہے ہیں۔ تشکیل نصاب Curriculam Designing۔ آپ BAMU کے UG اور PG سطح پر بورڈ آف اسٹڈیز (Board of Studies) کے ممبر رہے ہیں۔

BAMU نے آپ کی کتاب ''انشاء اور ترجمہ میں مہارت کس طرح پیدا کریں'' کو ایم۔اے اردو کے طلباء کے لئے بطور eference Book منظور کیا ہے۔ آپ کو ناگپور یونیورسٹی نے بطور سوالیہ پرچہ نگار (Paper Setter) اور ممتحن مدعو کیا ہے۔ مولانا نے اب تک حسب ذیل تین عربی کتابوں کا سلیس اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ (الف) راہ نجات (ب) اسلام امن کا علمبردار اور دہشت گردی کا مخالف (ج) فقہ اسلامی اور مستشرقین۔ (د) مولانا نے امریکہ کی نومسلمہ محترمہ مریم جمیلہ کی انگریزی کتاب "Western Imperialism Menaces Muslims" کو بذریعہ ترجمہ عربی قالب میں ڈھالا ہے۔ اسی طرح دیگر سماجی اور تعلیمی خدمات اور قومی سطح کے سمیناروں اور کانفرنسوں میں مولانا

پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔مولانا نے ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی جانب سے قومی سطح پر منعقدہ سیمناروں میں اپنے گرانقدر مقالات پیش کیئے۔آپ نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجیز .C.I.E.F.L. Hyd کے سمینار میں اپنا مقالہ پیش کیا۔آپ نے عالمی رابطہ ادب اسلامی (Universal League of Islamic Literature) کی جانب سے منعقد کیئے جانے والے سیمناروں میں لکھنو، پٹنہ، بنگلور، رائے بریلی، حیدرآباد، بھٹکل اور اورنگ آباد کے اجلاسوں میں اپنے مقالات پیش کیئے۔اسی طرح اسلامی فقہ اکیڈمی دہلی کے سیمناروں میں آپ نے شرکت کی اور مقالات پیش کیئے۔

مختلف معیاری ادبی اور دینی مجلوں، رسالوں، ہفتہ وار پرچوں اور روزناموں میں ابتک آپ کے (۲۶۹) مضامین شائع ہو چکے ہیں۔اسکے علاوہ آپ کی (۲۹) کتابیں اب تک زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں جن کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔لائف ممبر، سروش ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی اورنگ آباد۔ممبر یونیورسل لیگ آف اسلامک لٹیریچر (عالمی رابطہ ادب اسلامی) لکھنو (U.P.) صدر انیق ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی، اورنگ آباد۔اورنگ آباد پیس ایسوسی ایشن، اورنگ آباد کے جلسوں میں شرکت اور تخاطب۔اورنگ آباد امن کمیٹی، قائم کردہ پولس کمشنر اورنگ آباد میں آپ مدعو کیئے جاتے ہیں اور امن کے سلسلہ میں آپ اپنی گراں قدر رائے پیش کرتے ہیں۔ تا حال (۲۵) سے زیادہ تقاریر آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد سے نشر ہو چکی ہیں۔جاری تحقیقی کام: بہ موضوع ''عربی زبان کی ترقی اور توسیع میں مہاراشٹر اسٹیٹ کا حصہ'' شاعری: اردو، عربی اور فارسی میں مختلف اصناف سخن جیسے نظم، غزل، نعت وحمد وغیرہ پر مبنی شعری تخلیقات (زیر طبع)۔مستقبل کے ادبی اور علمی پراجکٹس: عربی مراٹھی لغت کی تدوین اور طباعت۔

ڈاکٹر مولانا محمد صدر الحسن ندوی مدنی نہ صرف ایک عالم دین، ایک خطیب شیریں مقال، ایک صاحب طرز ادیب ہی ہیں بلکہ ایک شاعر خوشنوا بھی ہیں۔آپ کا تعارف ادھورا رہیگا جب تک کہ آپ کی باغ و بہار شگفتہ نثر اور شاعری کے چند نمونے آپ کی نگاہوں سے نہیں گزر جاتے۔اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''صالح ادبی ذوق کے حامل ادباء سسکتی اور جاں بلب انسانیت کے لئے مسیحا ہیں۔ ظلم و بربریت اور درد والم میں ڈوبے ہوئے معاشرہ کیلئے مرہم جان آفریں ہیں۔ریاض اسلام کے گل ولالہ اور چمنستان محمدی کی باد بہاری ہیں۔شبستان ملت بیضا کے سرو سمن اور میدان کفرو ضلالت کے تیغ وتفنگ ہیں۔آسمان دانش وآگہی کے مہر و ماہ اور صحرائے بے آب وگیاہ کے لئے ابر کرم ہیں۔شب دیجور اور تیرہ وتاریک ماحول کے لئے ماہ چہاردہم اور کرمک شب تاب ہیں ظلم و بربریت اور نفرت وعداوت کے سیل رواں کے لئے پشتہ ناپیدا کنار ہیں، غم واندوہ اور حزن وملال میں آغشتہ اقوام کے لئے مژدہ جانفزا اور نغمہ دل کشا ہیں۔فضائے گردوں کے شہپر وشہباز اور خیابان وجود کے لالہ ونرگس ہیں''۔

"حیات و کائنات کے بہت سارے حقائق ہر دور میں فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار رہے ہیں، قلم کی سیاہی نے نہ جانے کتنے اوراق سیاہ کر ڈالے لیکن دلائل کے انبار تلے خاکستر میں نہاں شرر کی طرح حقیقت منہ پر نقاب ڈالے طاق عقل پر جوں پڑی تھی یوں ہی پڑی رہی، وہ، کبھی عقل انسان کی طرفہ طرازیوں پر ماتم کناں ہوئی اور کبھی اس کی ژرف نگاہی، دروں بینی اور اس کی نکتہ سنجیوں پر انگشت بہ دنداں، کبھی اصولوں کے تغیرات کو ثبات کے دامن میں پناہ ملی تو کبھی ثبات نے رہن رسا اور فکر بے پروا کی رزم آرائیوں میں لرزاں وترساں در آنے کی سعی لا حاصل کی۔ان بزم ہائے رست وخیز میں انسانی آبادی اس کشتی کی طرح ورطہ حیات میں

جھکولے کھاتی رہی جو دریا کی تندوتیز موجوں کی آغوش میں گھر گئی ہو۔ اندھیرا گھپ ہو کنارا دور ہو، طوفاں بپا ہو اور برق و باراں اپنی جلوہ سامانیوں میں مصروف ہو"۔

اسی طرح آپ کی نظموں اور غزلوں کے یہ نمونے بھی ملاحظہ فرمائیں:

زمانے کا تغیر بھی عجب ہے　　تغیر ہی تغیر کا سبب ہے
مسلماں رام ہوتا جارہا ہے　　یہ نکتہ عام ہوتا جارہا ہے
اگر ہوتا ذرا بھی ہم میں دم خم　　پئے تعمیل کرتے سر نہ خم ہم
کبھی حرکت تدبّر سے معرّا　　تدبّر سے کبھی حرکت مبرّا

یہ تبسم یہ تکلم یہ تغافل یہ ادا
ہر نفس جاتا ہے دیدۂ معصوم بہک

متاع راز ہستی کون جانے کس طرح جانے
جنوں جب شب کو سوئے ہے تو فرزانہ جگادے ہے

سفینے کو جلایا تھا کبھی اسلاف نے اس کے
یہ شیدائے نشیمن کن فکانی بھول بیٹھا ہے
کبھی گفتار کے بادل سے بارش ہو نہیں سکتی
جہل بردوش قانون جہانی بھول بیٹھا ہے

سلام اے ابر رحمت صاحب الطاف رحمانی

سلام اے فخر گیتی نازشِ تخلیق یزدانی
تلاوت، تزکیہ، تعلیمِ حکمت مقصد بعثت
صلائے عام سے تیرے، ملی فکروں کو تابانی
تیری دعوت سے قلعی کھل گئی کفر و ضلالت کی
ہبل نے، لات نے، عزیٰ نے، آخر ہار ہی مانی

تنہائیوں کی رات تھی یادش بخیر وہ
لمحات جلوتوں کے بھی فرحت اثر نہ تھے

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے کھنچے ہے
اتنا ہی ملے ہے مجھے آرام زیادہ
دیدار کی حسرت رہی دل میں نہ تمنا
کر لطف و عنایت کو نہ بدنام زیادہ

اس کے نالے کے درمیان پنہاں
کچھ تو غربت رہی ہوگی

مہ و پرویں سے کھیلنے والے
روز و شب گن رہے ہیں تاروں کا

زندہ ہے کائناتِ عہد الست

یاں کوئی لات اور منات نہیں

جناب دل کی خاطر ہم ہمیشہ شاد رہتے ہیں
مگر شاید ہی برسوں میں کوئی ان کا جواب آیا
ہمیشہ تشنہ لب پھرتا رہا موجوں میں دریا کی
عجب قسمت تھی حصہ میں وہی آخر سراب آیا

ہمیشہ میں رہا زاہد سے ناخوش
سبق دیتا ہے وہ سود و زیاں سے

عزیز تم نے مجھے کس جرم کی سزا دی ہے
فقط یہ بات کہ خواہش تھی ایک مدت سے

میرا درد نا رسا ہو تیرے بام تک نہ پہنچے
کوئی اضطراب دل کا تیرے نام تک نہ پہنچے

ہمیں امید ہے کہ مولانائے محترم کی ''نشریات مدنی'' کی گرم جوشی کے ساتھ پذیرائی ہوگی جس کی یہ مستحق ہے۔

ڈاکٹر ثاقب انور

اورنگ آباد۔ ۵ مئی ۲۰۰۴ء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آباد تحریریں

نورالحسنین

(اناؤنسر آکاش وانی، اورنگ آباد ومدیر سہ ماہی ''دلرس میگزین'' اورنگ آباد)

ڈاکٹر محمد صدرالحسن ندوی مدنی کا شمار میں ان لوگوں میں کرتا ہوں جن کے دیکھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے۔ پابندِ صوم وصلواۃ، پکے مسلمان، بالغ عالم، مطالعے کے شوقین، درس و تدریس کا منصب، شہد سے میٹھا لہجہ، تقریر وتحریر پر قدرت، اردو اور عربی پر یکساں مہارت، اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب پر بھی گہری نظر، ذہن کشادہ، تعصب وبغض سے نفرت، زبان کے کھرے، مزاج میں انکساری، طبیعت میں اطمینان، چاندنی کی طرح شفیق، لیکن عملی میدان میں فولاد کی طرح سخت، نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ، اجلے باطن کی طرح بدن پر سفید براق لباس، اتنے سارے اوصاف اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو انسان فرشتہ ہو جائے۔ لیکن مولانا صدرالحسن ندوی کے پاؤں پوری استقامت کے ساتھ زمین پر ٹکے ہوئے ہیں۔ بس یہی وہ خوبی ہے جس نے ان کی شخصیت کو دلوں میں اتار دیا ہے۔

میں پہلی بار جب ان سے ملا تو مجھے انکی ذات میں ایک ایسا عالم نظر آیا جو اسلامی علوم کے علاوہ ادب عالیہ پر بھی گہری نظریں رکھتا ہے۔ چنانچہ بہت جلد ہماری یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی اور وہ ریڈیو کی نشریات سے جڑ گئے اور مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ تقریریں ہر خاص وعام کو متوجہ کرنے لگیں۔ یہ کتاب ان کی نشریاتی تقاریر کا ایک گلدستہ ہے۔

ریڈیائی نشریات نے تفریحی پروگراموں کے علاوہ ثقافتی، سیاسی، تہذیبی، معاشرتی،

مذہبی، ادبی موضوعات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ تاریخ ساز شخصیات کی حیات اور کارناموں پر روشنی بھی ڈالی ہے اور ایسے افراد کی طرف بھی نگاہیں دوڑائیں جو قومی سطح پر بہت زیادہ قد آور نہ ہوں لیکن علاقائی سطحوں پر ان کے کارنامے یقیناً یاد رکھنے کے لائق ہیں۔ چنانچہ ہوائیاں، روشن چراغ، میرا شہر میرے لوگ، سائنسی شعاعیں، سے لیکر نہ جانے سارے ہندوستان میں کتنی ہی کتابیں ریڈیائی نشریات کے باعث وجود میں آئیں۔

ڈاکٹر محمد صدرالحسن کا اسلوب دل کو چھونے والا ہے۔ وہ نہایت آسانی سے اپنے نفس مضمون پر آجاتے ہیں۔ زبان و بیان پر انہیں خلاّقانہ قدرت حاصل ہے۔ محاورہ روزمرہ، استعارہ کنایہ کی موجودگی ان کی نثر کو گہرائی و گیرائی عطا کرتی ہے۔ اپنی تحریروں میں وہ اردو فارسی اشعار اس خوبی سے پروتے ہیں گویا وہ ان کی خاطر خلق کئے گئے ہوں۔ ان کی اس کتاب میں دو مضمون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے متعلق ہیں۔ تین تقریریں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کی قربانیوں کا احاطہ کرتے ہوئے واقعہ کربلا کی شدت کو بیان کرتی ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت مریم کی حیات پاک پر ایک ایک مضمون شامل ہے۔ عیدین کی اہمیت اور ان کے آفاقی پیغام پر تین مقالے ہیں اور پروگرام مقدس کتابوں کی روشنی میں، جس کے تحت کسی ایک موضوع پر مختلف مذاہب کی روشنی میں گفتگو کی جاتی ہے۔ سات تقریریں شامل ہیں اس کے علاوہ اسی کتاب میں تین مضمون ادبی موضوعات سے متعلق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ وہ ریڈیو کیلئے لکھیں، یا اخبار و رسائل کی خاطر، ان کی علمیت سر چڑھ کر بولتی ہے۔ مثلاً حضرت امام حسنؓ کے مثالی کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ۔

”حضرت امام حسنؓ نے دنیا کے سامنے ایک انوکھا اور اچھوتا نمونہ پیش کیا۔ جس کی مثال پیش کرنا تاریخ عالم کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ آپ نے داخلی امن و امان، ملک کی اصلاح و ترقی، انسانی خون کی قیمت، تعمیری منصوبوں، فتنہ و فساد کی بیخ کنی، طاقت و قوت کی صحیح استعمال انسانی عظمت و شرافت اور اصول کی بالادستی کو ایسی حکومت پر ترجیح دی جس کی آبیاری معمار قوم کے لہو اور جس کی عظمت کا مینار لاشئہ آدم سے تیار کیا گیا ہو“۔

حضرت امام حسینؓ کا خلافت سے دستبردار ہونا حق کی راہ کا ایک ایسا پیغام ہے جو رہتی دنیا تک مثالی رہے گا۔ حق اور حق گوئی کی راہ بڑی کٹھن ہوتی ہے، صبر و استقلال کا ایک ایسا امتحان ہوتا ہے جہاں اچھے اچھوں کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں۔ اپنے مضمون ”حق گوئی“ میں ڈاکٹر صدرالحسن ندوی نے اس کی وضاحت کچھ اس انداز سے کی ہے کہ حق گو اپنی راہ کو پُر خطر دیکھنے کے باوجود بھی قلبی سکوں پاتا ہے اور خوشی خوشی حق کی راہ کا مسافر بن جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور پر نگاہیں ڈالئے اور ڈاکٹر صاحب کی علمیت کی داد دیجئے۔

”حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور حق گوئی اور راستبازی کے صلے میں آزمائشوں سے دوچار ہونا خالق کائنات کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے ہے اور جب تک یہ کائنات ہے اس وقت تک باقی رہے گا اور جب تک کوئی قوم یا کوئی فرد اس گذرگاہ سے نہیں گذرتا اور حق گوئی کی اس کسوٹی پر پوری طرح نہیں اترتا کامیابی اس سے کوسوں دور رہتی ہے“۔

حضور اکرم ﷺ کی سیرت کی روشنی میں واقعہ معراج پر نشر کی گئی تقریر ”اے فرش نشیں عرش تیری مسند ہے“ کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیے، زبان و بیان پر قدرت اور انشاپردازی کی چاشنی، الفاظ کا دروبست اور اظہار کا سلیقہ کیسی داد وصول کر رہا ہے۔

” اب سرزمین بطحا کے رب نے چاہا کہ طائف کے دکھیارے کو مژدہ جانفزاء

سنائے یہ سنائے کہ اب دور آزمائش ختم ہوا اور یہ بتائے کہ اے میرے محبوب نگہ التفات کا گلہ نہ کرے، اگر تو التفات کے قابل نہیں تو بھلا کون التفات کے قابل ہوگا۔ مکہ اور طائف کی سرزمین اگر تنگ داماں کا گلہ کررہی ہے تو تجھے ارض شام کی وسعت ناپیدا کنار کی سیر کرواؤنگا۔ اور اگر فرش تیرے وجود کے درپے ہے تو عرش تیری مسند بنے گی۔ زندگی کی چالیسویں بہار میں آپ ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد زندگی کی دس بہاریں اس حال میں گذریں کہ خزاں رسیدہ چمن کو بھی اس بہار پر ترس آئے۔ اب خزاں رخصت ہوئی اور بہار نے اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ خزاں کو الوداع کہا اور معراج اس بہار کی تمہید بنی۔ اب شب بہار آئی اور شب بہار میں وہ ساعت ہمایوں آئی جو دیوان قضاء میں طائف کے دکھیارے کی سیر ملکوت کے لئے مقرر تھی اور جس میں پیش گاہ ربانی کے دیوان خاص سے حکم خاص کا اجراء اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا۔

ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی کسی بھی موضوع کی افادیت کو اپنے انداز سے بھی سوچتے ہیں۔ مثلاً پڑوسی کے حقوق کے سلسلے میں وہ اسلام کا نقطہ نظر بھی واضح کرتے ہیں اور دیگر مذاہب کی روشنی میں گفتگو کرتے ہوئے اسے سماجی معاشرتی زندگی کا فرض بھی قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

"پڑوسی مسلمان ہو یا غیر مسلم، مالدار ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، صاحب حیثیت ہو یا مفلوک الحال، رشتہ دار ہو یا اجنبی، پڑھا لکھا ہو یا ناخواندہ، مرد ہو یا عورت، بیمار ہو یا تندرست، ملازمت پیشہ ہو یا تجارت پیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک انسان کا سماجی اخلاقی مذہبی فریضہ ہے"۔

اسلامی شخصیات اور اخلاقی موضوعات سے ہٹ کر ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی جب

ادبی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا بھی حق ادا کردیتے ہیں۔ یہاں بھی ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور بصیرت داد طلب کرتی ہے۔ اردو میں سفرنامے کی روایت، کے تحت وہ اپنے قاری پر واضح کرتے ہیں کہ ادب میں سفرنامے کی اہمیت کیا ہے؟ یہ کیوں لکھا جاتا ہے؟ اس کی افادیت کیا ہے؟ اور یہ بھی کہ اس کی تعریف کیا ہوسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"سفرنامہ روداد سفر کا نام ہے۔ جو مثبت یا منفی جذبات و خیالات اور اس کے اثرات سے مرتب ہوتا ہے۔ اس طرح سفرنامہ وہ طرز تحریر اور اسلوب بیاں ہے جس میں سیاح اپنے داخلی احساسات کو خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، قلبی اور طبعی کیفیات ظاہر کرتا ہے۔ جس میں قلم کی جولانی بھی ہوتی ہے اور فکر و خیال کی طغیانی بھی جولانی و طغیانی کی امتزاجی کیفیات اتنی وسیع عمیق اور دلاویز ہوتی ہے کہ وہ قاری یا سامع پر اثر انداز ہوتی ہے اور قلب نظر اور فکر خیال کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ یہ سفرنامے گھر سے شروع ہوتے ہیں اور غریب خانے کی دہلیز پر اختتام پذیر ہوجاتے ہیں۔ کبھی اس میں جان لیوا طوالت ہوتی ہے تو کبھی کبھی جاں گسل اختصار"۔

غرض! اس کتاب میں شامل ہر مضمون دعوت فکر دیتا ہے اور عمل کی طرف راغب کرتا ہے۔ چند صفحات میں ان سب کا احاطہ کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔ ان کے تعلق سے مختصراً میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہر مضمون اپنی ضرورت اور اہمیت تسلیم کرواتا ہے، ممکن ہے ان کو پڑھتے ہوئے آپ کو کچھ تشنگی کا احساس ہو تو میں کہوگا کہ یہ سارے مضامین ریڈیو اسٹیشن کی اپنی ضرورت اور اپنے ضابطوں کے تحت لکھوائے گئے ہیں یہاں وقت (Duration) کا بھی مسئلہ ہوتا ہے اور دیئے گئے وقت کے مطابق ہی اسے قلمبند کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس تشنگی کے ذمہ دار ڈاکٹر صاحب نہیں ہیں۔

ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی کی یہ کتاب جہاں ان کی کتابوں کی فہرست میں ایک اور کتاب کا اضافہ کرے گی وہیں اس خاکسار کے لئے بھی باعث اطمینان ہوگی کہ اس نے اپنی ملازمت کے دوران محض تفریحی پروگرام ہی نشر نہیں کئے بلکہ کچھ ایسے پروگرام بھی پیش کئے جو آواز کی صورت آفاق میں گم تو ہو گئے لیکن کاغذ کی سطح پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آباد ہو گئے۔

اس کتاب کی اشاعت پر میں انہیں خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نور الحسنین

۷/مئی ۲۰۰۴ء اورنگ آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت حسنؓ اور ان کا مثالی کردار

(تاریخ نشر ۹/ستمبر ۱۹۹۱ء)

اوراق تاریخ پر ثبت واقعات کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اس عالم کی تاریخ۔ دنیا میں بے شمار واقعات پیش آئے، آرہے ہیں اور آتے رہیں گے۔ لیکن بعض واقعات ایسے بھی پیش آتے ہیں جن کے نقوش انمٹ اور جن کی اثر انگیزی ابدی اور دائمی ہوتی ہے، وہ واقعات ایسے رہنما اصول کی بنیاد فراہم کرتے ہیں جس سے قوموں اور ملتوں کے عروج وزوال کی ڈگر متعین ہوتی ہے اور موت وزیست کی کشمکش سے دوچار انسانیت، قوت وتوانائی حاصل کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری ایام اور حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں ایسے دل دوز، خون آشام، جگر خراش اور دل فگار واقعات پیش آئے جن کا عینی نہیں بلکہ کتابی مشاہدہ بھی دلوں کو رنجیدہ اور آنکھوں کو نمدیدہ کر دیتا ہے۔ حضرت علیؓ کی زندگی کے آخری ایام ہیں، زہر آلود خنجر کی سمیت پورے بدن میں پھیل چکی ہے اور صحت وزندگی سے یک گونہ مایوسی، حضرت جندب بن عبداللہؓ پوچھتے ہیں کیا آپ کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں؟ فرمایا ''میں تم کو نہ اس کا حکم دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں تم لوگ اس کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہو''۔

حضرت علیؓ کی وفات کے بعد وابستگانِ دامن مرتضوی نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور رمضان ۴۰ھ میں آپ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے، عظیم محدث امام

نوویؒ کے بیان کے مطابق چالیس ہزار سے زیادہ افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور تقریباً سات ماہ تک حجاز، یمن، عراق اور خراسان پر حکمراں رہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ہی سے حضرت امیر معاویہؓ کے دل میں شام کے علاوہ جس کے وہ گورنر تھے پورے عالم اسلام کی تولیت کی تمنا تھی۔ حضرت امام حسنؓ کی امن پسندی، صبر وتحمل اور ان کی صلح جویانہ طبیعت سے حضرت معاویہ اچھی طرح واقف تھے، اس لئے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد عالم اسلام کی تولیت کے منصبِ عظیم پر فائز ہونے کیلئے انہوں نے فوراً اعراق پر فوج کشی کردی۔ جب حضرت امام حسنؓ کو شامی فوج کی پیش قدمی کی اطلاع ہوئی تو آپ نے قیس بن سعد انصاری کی قیادت میں فوج روانہ کی، اور خود ان کے پیچھے پا بہ رکاب ہوئے۔ فوج کے علاوہ چالیس ہزار کوفی آپ کے ایک اشارہ پر سر کٹانے کے لئے تیار تھے، خود حضرت امام حسنؓ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ عرب کے سر میرے قبضے میں تھے میں جس سے صلح کرتا اس سے وہ صلح کرتے اور جس سے میں جنگ کرتا اس سے وہ جنگ کرتے۔

قوت وسطوت، سرفروشوں، جاں نثاروں اور جواں مردوں کے جم غفیر کی موجودگی میں حضرت حسنؓ کے لئے شامی فوج سے نبرد آزما ہونا اگر آسان نہیں تو کچھ مشکل بھی نہیں تھا لیکن جنگ کی ہولناکی کے مشاہدات آپ کے سامنے تھے! آپ کے دلِ دردمند سے ایک آواز نکلی کہ اس جنگ کے نتائج بڑے بھیانک ہوں گے اور اس کے لئے بہت بھاری قیمت چکانی پڑے گی، خون کی ندیاں ہونگی اور لاشہ مسلم کا انبار ہوگا۔

حضرت جعفر طیارؓ کے صاحبزادہ سے خلافت سے دستبرداری کا سب سے پہلی مرتبہ خیال ظاہر کیا اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

''میں نے ایک رائے قائم کی ہے امید ہے کہ تم بھی اس کی تائید کرو گے۔ ملک میں فتنہ وفساد برابر بڑھ رہا ہے، خون کی ندیاں بہہ چکی ہیں، عزیز کو عزیز کا پاس نہیں، قطع رحمی کی گرم بازاری ہے، راستے خطرناک ہو رہے ہیں، سڑکیں بیکار ہوگئی ہیں، اس لئے میں خلافت سے دستبردار ہو کر مدینہ چلا جانا چاہتا ہوں۔'' (ابن عساکر ۴ ص ۳۲۱)۔

آپ مسلمانوں کے خون کی قیمت پر خلافت خریدنا نہیں چاہتے تھے اس لئے چند شرائط پر ربیع الاول ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبرداری پر آمادہ ہوگئے اور اس کے بعد مجمع عام سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا

''مسلمانو! میں فتنہ وفساد کو سخت ناپسند کرتا ہوں، اپنے جدّ امجد کی امت میں فتنہ وفساد کو دور کرنے، مسلمانوں کی جان و مال کو محفوظ رکھنے کے لئے میں نے حضرت امیر معاویہ سے صلح کی اور ان کو امیر وخلیفہ تسلیم کرلیا، اگر امارت اور خلافت ان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا اور اگر یہ میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا''۔

اس طرح حضور اکرم ﷺ کی اس پیشین گوئی کی تصدیق ہوگئی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''میرا یہ لڑکا سردار ہے خدا اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرائے گا''

یہ سن ''عام الجماعۃ'' یعنی اتحاد واتفاق کا سال کہلایا امن وسکون کی فضا پیدا ہوئی، جو طاقت خانہ جنگی کی نذر ہو رہی تھی، تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں صرف ہونے لگی۔ حضرت حسنؓ نے دنیا کے سامنے ایک انوکھا اور اچھوتا نمونہ پیش کیا، جس کی مثال پیش کرنا

تاریخ عالم کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔آپ نے داخلی امن وامان، ملک کی اصلاح وترقی، انسانی خون کی قیمت، تعمیری منصوبوں، فتنہ وفساد کی بیخ کنی، طاقت وقوت کے صحیح استعمال، انسانی عظمت وشرافت اوراصول کی بالادستی کوایسی حکومت پر ترجیح دی جس کی آبیاری معمارِقوم کے لہواور جس کی عظمت کا مینار لاشۂ آدم سے تیار کیا گیا ہو۔

حضرت حسنؓ، صورت اور سیرت دونوں میں ذات نبوی ﷺ کی تصویر تھے، ضبط و تحمل، صبروشکیب، عجزوانکساری اور ہمدردی وغمگساری میں امتیازی اوصاف کے حامل تھے، نرم گوئی اورشیریں کلامی کے بارے میں عمیرابن اسحٰق فرماتے ہیں حضرت حسنؓ ہی ایک ایسے شخص تھے جب بات کرتے تھےتو میں چاہتا تھا کہ آپ باتیں کیئے جائیں اوراپنا کلام ختم نہ کریں۔

طبیعت میں انکساری تھی، سواریوں کے ہوتے ہوئے پیادہ پا پچیس حج کیے، فرماتے تھے کہ مجھے خدا سے حجاب معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ملوں اوراس کے گھر پیادہ نہ گیا ہوں۔فیاضی اورانفاق فی سبیل اللہ آپ کا خاندانی وصف تھا۔عمر میں تین باراپنے کل مال کا نصف حصہ راہ خدا میں لٹادیا،نفس اورزبان پر قابل رشک گرفت تھی، اپنی ذات کے لئے نہ کبھی کسی سے انتقام لیااورنہ کبھی آپ کی زبان کسی تلخ اوردرشت کلام سے آلودہ ہوئی۔

خوف خدااورکمال احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب آپ کوزہر دیا گیااوراس کی سمیت کی وجہ سے آپ صاحبِ فراش اور زندگی سے مایوس ہوگئے تو حضرت امام حسینؓ کو بلا کران سے واقعہ بیان کیا۔آپ نے زہر دینے والا کا نام پوچھا،فرمایا: نام پوچھ کرکیا کروگے؟ عرض کیاقتل کردونگا۔فرمایا: اگر میراگمان صحیح ہےتو خدا بہتر بدلہ لینے والا ہے اوراگر غلط ہےتو میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کوئی ناکردہ گناہ پکڑا جائے۔

وفات کے بعد اپنے نانا (فداہ ابی وامی) کے پہلو میں دفن ہونے کی بڑی تمناتھی

لیکن وصیت کی کہ اگر فتنہ وفساد کا اندیشہ ہوتو روضہ نبوی ﷺ میں دفن کرنے پر اصرار نہ کرنا اور بقیع کے گورغریباں میں دفن کردینا۔

آپ شعبان سن ۳ھ میں پیدا ہوئے۔رمضان سن ۴۰ھ میں مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے اورربیع الاول ۴۱ھ میں خلافت سے دستبردار ہوگئے۔

زہرخوارنی کے واقعہ کے تیسرے دن ربیع الاول سن ۵۰ھ میں جامِ شہادت نوش فرما کرصلح وآشتی کا یہ پیامبر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہم سے رخصت ہوگیا۔

آج حضرت حسنؓ ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن آپ کی زندگی کے واقعات کی ضوفشانی رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔اورتاجدارِاقلیم صلح وآشتی، مرقع رحمت وشفقت اور پیکرِعفو کرم کی یاد، لاثانی اور لافانی رہے گی۔

آج ضرورت ہے اسوہ حضرت حسنؓ پر عمل کرتے ہوئے ایسی فضاء اور ماحول بنائیں جس میں امن وسکون، ہمدردی وغمگساری پروان چڑھے اورانسان ملک وملت اور انسانیت کا احترام کرنا سیکھے۔

مقدس کتابوں کی روشنی میں: پڑوسیوں کے حقوق

(تاریخ نشر ۲/اپریل ۱۹۹۳)

حقوق اور فرائض میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ جب تک حقوق اور فرائض کو ان کا صحیح مقام اور معاشرہ میں ان کے تئیں احساس ذمہ داری اور ہر قسم کے مفادات سے بلند ہو کر بے لوث جذبہ پیدا نہیں ہوگا اس وقت تک ایک صالح معاشرہ اور ایک اچھی سوسائٹی کے وجود کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ آج حقوق اور فرائض کے عدم احساس یا احساس کے باوجود ان کی طرف سے مجرمانہ غفلت نے پورے ملک کو تباہی اور ہلاکت کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ آج ہمارے معاشرہ کا یہ عام رجحان ہے کہ بہر حال ہمیں اپنا حق ملنا چاہئے ایک خطرناک صورتحال اختیار کرتا جارہا ہے۔ حالاں کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے حقوق ملیں تو ہمیں اپنے دل کی گہرائیوں میں اس احساس کو بھی بیدار کرنا چاہئے کہ ہم میں فرائض کی ادائیگی کا بھی احساس ہو کیوں کہ ہمارے حقوق دوسروں کے حق میں فرائض ہیں اور ہمارے فرائض دوسروں کے حقوق ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں حقوق اور فرائض کو ان کا صحیح مقام عطا کیا گیا ہے۔ اور معاشرتی زندگی میں تمام مذاہب کا سماجی ڈھانچہ حقوق و فرائض کی بنیاد ہی پر کھڑا ہوتا ہے۔ مذاہب عالم میں حقوق کا دائرہ صرف انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی اس دائرہ میں آتے ہیں اسی لئے موجودہ زمانے میں جس طرح حقوق انسانی کی محافظ تنظیمیں وجود میں آئی ہیں۔ اسی طرح حقوق حیوانات کی تنظیمیں بھی سرگرم ہیں۔

ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ اس صدی کے پچاسویں دہائی میں روس نے اپنا پہلا خلائی

سیارہ چاند کی طرف بھیجا تھا، یہ دیکھنے کے لئے کہ خلاء میں جاندار زندہ رہ سکتا ہے یا نہیں ایک کتیا اس کیپسول نما سیارہ میں رکھ دی گئی تھی۔ اس کا نام لائیکا (Lyca) رکھا گیا تھا۔ اس معاملہ پر بین الاقوامی حیوانات کی تنظیم نے روس سے سخت احتجاج کیا کہ ایک جاندار پر ظلم کیا گیا ایک بے زبان کی جان خطرے میں ڈال دی گئی اور روس کے خلاف ملامت کی تجویزیں پاس کی گئیں۔

تمدنی زندگی کے دائرہ کی وسعت کے ساتھ پڑوسی کے مفہوم میں وسعت ایک قدرتی بات ہے۔ عموماً ایک انسان کی جہاں سکونت ہوتی ہے اس کے ارد گرد میں آباد لوگ پڑوسی کہلاتے ہیں۔ رہائش اگر دور ہے تو وہ بھی پڑوسی کہلاتا ہے اور رہائش اگر قریب ہے تو وہ بھی پڑوسی کہلاتا ہے اگر فرق ہوتا ہے تو صرف قرب اور بعد کا۔ ان کی رہائش چوں کہ مستقل ہوتی ہے اس لئے یہ مستقل پڑوسی کہلاتے ہیں۔

پڑوسیوں کی ایک قسم عارضی بھی ہوتی ہے جن سے ہمارا سابقہ محدود اوقات کے لئے پڑتا ہے۔ یہ لمحات ہمیں بس اسٹینڈ، ریلوے اسٹیشن اور ایر پورٹ، آفس، دوران سفر، سمینار اور کانفرنس وغیرہ میں میسر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

حسن سلوک کرو والدین کے ساتھ اور رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مفلسوں کے ساتھ اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ اور دور والے پڑوسی کے ساتھ اور ہم مجلس عارضی پڑوسی کے ساتھ (سورہ نساء ۳۶)۔

پڑوسی مسلمان ہو یا غیر مسلم، مالدار ہو یا غریب، جوان ہو یا بوڑھا، صاحب حیثیت ہو یا مفلوک الحال، رشتہ دار ہو یا اجنبی، مستقل ہو یا عارضی، پڑھا لکھا ہو یا ناخواندہ، مرد

ہو یا عورت، بیمار ہو یا تندرست، ملازمت پیشہ ہو یا تجارت پیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک انسان کا سماجی اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ''مخلوق اللہ کا کنبہ اور اللہ کی مخلوق میں سب سے بہتر وہ ہے جو اللہ کے کنبہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اپنے ہم سایہ کی شکایت کرنے لگا آپ ﷺ نے فرمایا جا اور صبر کر۔ وہ دو تین بار آیا آپ ﷺ نے فرمایا اور اپنا مال و اسباب مکان سے نکال کر راستہ پر ڈال دے اس نے اپنا مال و اسباب راستہ میں ڈال دیا۔ لوگوں نے وجہ پوچھنی شروع کی تو اس نے اپنے ہم سایہ کی ایذا دہی کا حال بیان کیا تو لوگوں نے اس کے ہم سائے پر لعنت کرنا اور بد دعا کرنا شروع کیا کہ اللہ اس کے ساتھ ایسا کرے۔ اس وقت اس کا پڑوسی آیا اور کہا چلو اپنے گھر چلو اب میں کوئی بات ایسی نہ کرونگا جو تجھ کو ناگوار ہو۔ (ابوداؤد)۔

انجیل متی میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عیسیٰؑ کے پاس آکر عرض کیا اے استاد میں کون سی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں، انہوں نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات پوچھتا ہے نیکی تو ایک ہی ہے لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو ان حکموں پر عمل کر۔ چوری نہ کر۔ جھوٹی گواہی نہ دے۔ اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر اور انجیل یوحنا میں ہے: میں تمہیں ایک نیا حکم دیتا ہوں کہ ایک دوسرے سے محبت رکھو کہ جیسے میں نے تم سے محبت رکھی۔ تم بھی ایک دوسرے سے محبت رکھو۔

ایک دوسرے کا خیال، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنا، ایک دوسرے کی خبر گیری اور ایک دوسرے کی ضرورت کا خیال اور اس کی نگہداشت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انجیل لوقا میں کہا گیا:

لوگوں نے ان سے یعنی یسوع سے پوچھا پھر ہم کیا کریں انہوں نے جواب میں ان سے کہا جس کے پاس دو کُرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔

جین دھرم میں بھی اصولی طور پر جو باتیں تسلیم کیگئی ہیں پڑوسیوں کے حقوق پر اس کی اہمیت پر ان اصولوں سے براہ راست روشنی پڑتی ہے وہ اصول یہ ہیں:

ہمیشہ سچ بولو، لالچ مت کرو، چوری مت کرو، کسی ذی روح کو مت ستاؤ، اپنی خواہشات کو مار کر زندگی گذارو۔

سکھ مذہب کے جو نو بنیادی اصول ہیں ان میں سے بعض اصولوں کا براہ راست تعلق حسن سلوک، حقوق اور خدمتِ خلق سے ہے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھا جائے، زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لوگوں کی خدمت کرنی چاہئے، گناہ گار وہ ہیں جو خدا کے مقررہ ضابطے کو توڑتے ہیں، ہندو مذہب میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو (مسلم) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیشہ حضرت جبرئیل مجھ کو پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے رہے یہاں تک کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ وہ ان کو ترکہ میں بھی حصہ دلا دیں گے (ابوداؤد)۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص مسلمان نہیں، وہ شخص مسلمان نہیں، وہ شخص مسلمان نہیں۔ عرض کیا گیا کون؟ فرمایا جس کی بدسلوکی سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔ (بخاری و مسلم)

پڑوسی کے حقوق کی رعایت اوراس کی راحت رسانی کا خیال ایک اچھے انسان اور ایک اچھے پڑوسی کی علامت ہے۔ایک دوسرے سے ہمدردی،غم گساری اورمحبت وایثاروقربانی کے جذبات سے دل کی کدورتیں دور ہوتی ہیں۔آپس کی رنجشیں ختم ہوتی ہیں اور باہمی تعاون و اخوت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں،اسی طرح دوریاں قربت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھرے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے۔(مسند احمد)۔

ہمارے نبی ﷺ نے صرف اسی کی تعلیم نہیں دی بلکہ جذبہ ہمدردی وہم سائیگی کو اپنے اس قول سے اور زیادہ بڑھایا: جب تم سالن پکاؤ تو شوربہ زیادہ کرواور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو۔(مسلم)۔

دو پڑوسیوں کے درمیان ہدیہ اور تحفہ کے تبادلے سے بھی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: کوئی پڑوسن کسی پڑوسن کے تحفہ کو حقیر نہ سمجھے چاہے وہ بکری کی ایک کھر ہی کیوں نہ ہو۔(مسلم و بخاری)۔

پڑوسی بیمار ہو تو اس کی تیمارداری،موت کی صورت میں جنازہ میں شرکت،مصیبت کے وقت اس کی مزاج پرسی اور تسلی دہی،مسرت وخوشی کے وقت تقریبِ مسرت میں شرکت بھی ایک اچھے پڑوسی کی علامت ہے۔حدیث میں ہے: اللہ کے یہاں وہ لوگ بہتر ہیں جو اپنے ساتھیوں کے لئے بہتر ہیں اور اللہ کے یہاں وہ پڑوسی بہتر ہے جو اپنے پڑوسی کیلئے بہتر ہے۔(ترمذی)۔

دو پڑوسیوں میں وہ پڑوسی ہمارے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہے جس کا دروازہ ہم سے قریب ہو۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے دو پڑوسی ہیں میں کس کے ساتھ حسن سلوک کروں، آپ ﷺ نے فرمایا جس کا دروازہ قریب ہو۔(ابوداؤد)۔

آج کل بڑے شہروں میں ہماری معاشرتی زندگی کے تارو پود بکھر رہے ہیں۔برسوں سے ایک ہی فلیٹ میں رہنے والا خاندان بغل میں دوسرے فلیٹ میں رہنے والے خاندان کے حالات وواقعات سے بے خبر رہتا ہے۔بعض دفعہ ایک دوسرے کے نام تک سے واقف نہیں ہوتا یہ بڑی افسوسناک بات ہے جس معاشرہ میں ناواقفیت کے سرحدیں اس حد تک وسیع ہوتی جارہی ہوں وہاں پڑوسیوں کے حقوق اوران کی اہمیت کی تلقین ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ہمیں مغربی معاشرہ کی اندھی نقالی اور تقلید کے بجائے اپنے مشرقی معاشرہ کی مشرقیت کو باقی رکھنا چاہئے اور پڑوسیوں کے حقوق کی حفاظت ہماری مشرقیت کا ایک لازمی جُز ہے۔جس کے بغیر ہم مشرقیت کا تصور ہی نہیں کرسکتے۔

جب تمام مذاہب نے مذہب وملت اور مسلک ومشرب کی تفریق کے بغیر پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی ہے تو غور طلب بات یہ ہے کہ آج ہمارا معاشرہ ان روشن تعلیمات کے باوجود کدھر جارہا ہے،جہاں سب سے زیادہ پامالی،سب سے زیادہ غفلت اورسب سے زیادہ بے حسی کا رویہ پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں اپنایا جاتا ہے۔یہ بات صرف افسوس ناک ہی نہیں بلکہ خطرناک اور خطرناک ہی نہیں بلکہ معاشرہ کی ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

ذاتی اور نجی مفادات سے بلند ہو کر ہمیں پڑوسیوں کے حقوق کی حفاظت کرنی چاہئے۔اوراس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے اور اس کو عام کرنے کی مسلسل کوشش کرنا ہمارا اور آپ کا سماجی،اخلاقی اور ملی فریضہ ہے تاکہ ایک اچھا سماج وجود میں آسکے۔اور لوگ امن و سکون اور بھائی چارہ کی فضاء میں سانس لے سکیں اور یہ ملک صلح وآشتی اور ایثار وقربانی کا گہوارہ بن جائے۔

مقدس کتابوں کی روشنی میں : حق گوئی

(تاریخ نشر ۶ راگست ۱۹۹۳)

صحیح اور غلط، سیاہ اور سفید اور حق و باطل کے درمیان جب معرکہ آرائی اور کشمکش شروع ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی سے مقصود یہ ہیکہ جس بات کو صحیح حق اور درست سمجھا جائے اور جس کے صحیح، درست اور حق ہونے میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو اس کو نہ صرف اپنے دل میں حق، صحیح اور درست سمجھے بلکہ وہ اس کا برملا اظہار بھی کرے۔ چاہے اس راہ میں اسکو مشکلات پیش آئیں، مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اور خطرات کی پُر خار وادیوں سے گزرنا پڑے لیکن جادۂ مستقیم اور حق گوئی و راستبازی سے منھ نہ پھیرے۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور حق گوئی او رراستبازی کے صلہ میں آزمائشوں سے دوچار ہونا خالق کائنات کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے ہے اور جب تک یہ کائنات ہے اس وقت تک باقی رہے گا اور جب تک کوئی قوم یا کوئی فرد اس گزرگاہ سے نہیں گزرتا اور حق گوئی کی اس کسوٹی پر پوری طرح نہیں اترتا کامیابی اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔

تمام مذاہب میں حق گوئی اور راستبازی کی تعلیم دی گئی ہے۔ انجیل میں ہے ''پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے کسی کو توڑے گا اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہی میں سب سے چھوٹا کہلائے گا لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور انکی تعلیم دے گا وہ آسمان کی بادشاہی میں بڑا کہلائے گا کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستبازی

فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوگے (انجیل متیٰ ۔۵۔۲۰)۔

انجیل میں دوسری جگہ ہے ''تم بُرے ہوکر کیوں کر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو۔ کیونکہ جو دل میں بھرا ہے وہی منہ پر آتا ہے۔ اچھا آدمی اچھے خزانے سے اچھی چیزیں نکالتا ہے اور بُرا آدمی برے خزانے سے بُری چیزیں نکالتا ہے اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو نکمی بات لوگ کہینگے عدالت کے دن اس کا حساب دینگے کیونکہ تو اپنی باتوں کے سبب سے راستباز ٹھہرایا جائے گا اور اپنی باتوں کے سبب سے قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔ (انجیل متیٰ ۱۲۔۳۷)۔

بدھ مذہب میں جو آٹھ اصول مقرر کیے گئے ہیں ان میں سچائی کو اولین اہمیت دی گئی ہے وہ آٹھ اصول یہ ہیں۔ سچا جذبہ۔ سچا برتاؤ۔ سچی نظر۔ سچی کوشش۔ سچی زبان۔ سچی خدمت۔ سچے خیالات اور سچا علم۔ مہاتما بدھ کی تعلیم یہ تھی کہ آدمی کو اگر نروان حاصل کرنا ہے تو اسے من کرم اور زبان سے سداچاری ہونا چاہئے۔

جین دھرم کی تعلیم جو پانچ باتوں میں محدود ہے اس کی ابتدا ہی راستبازی اور حق گوئی سے ہوتی ہے وہ اصول یہ ہیں۔ ہمیشہ سچ بولو۔ لالچ مت کرو۔ چوری مت کرو۔ کسی ذی روح کو مت ستاؤ۔ اپنی خواہشات کو مار کر زندگی گزارو۔

سکھ مذہب کے جو نو موٹے اصول ہیں انکی ابتداء بھی راستبازی سے ہوتی ہے وہ یہ ہے، سچائی خدا ہے، سچائی آدمی کو مایا کے بندھوں سے آزادی دلاسکتی ہے اتفاق بڑی طاقت ہے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھا جائے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لوگوں کی خدمت کرنی چاہئے۔ گرو کی سیوا کرنے سے خدا ملتا ہے۔ بیڑی، سگریٹ، شراب پینا یا کوئی نشہ کرنا ذلت کی بات ہے۔ اس دن سے ڈرتا رہ جب خدا تیرا انصاف کریگا۔ گناہ گار وہ ہیں

جنہوں نے حدودِ الٰہی کو توڑا۔

ست نامی فرقہ کے سات اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ ''نہ کبھی جھوٹ بولو نہ کسی کی برائی کرو۔ ہندو مذہب میں ستیم شیوم سندرم کا اصول زمان زد خلائق ہے۔''

انسان کے قول وعمل کے درست ہونے کی اساس یہ ہے کہ اس کی زبان اور اس کے دل میں ہم آہنگی ہو کیونکہ جو شخص راستباز اور حق گو ہوگا وہ اپنے آپ کو رذائل سے دور کرنے اور فضائل سے آراستہ کرنے کی کوشش کرے گا وہ وفادار اور وفاکش ہوگا جو بات اس کے دل میں ہوگی وہی بات اس کی زبان پر ہوگی اس میں پیچھے کچھ اور سامنے کچھ کی عادت نہو گی ۔ وہ قابل اعتماد ہوگا وہ حق جو حق شناس اور حق گو ہوگا کسی کا خوشامدی نہ ہوگا۔

قرآن کریم میں ارشاد خدی وندی ہے۔ اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ کے گواہ بنو، اگر چہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی کیوں نہ ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا۔ (النساء ۳۵)۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے ۔اور جب بات کہو تو حق بات کہو اگر چہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو۔ (انعام ۔۱۹)۔

ہمارے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا جن میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جن میں ان میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی علامت پائی جاتی ہے جب تک کہ وہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ جب امانت اس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب کوئی وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔

حق کا تعلق دل سے بھی ہے۔ زبان سے بھی اور عمل سے بھی۔ زبان کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے جو بات نکلے سچی ہو۔ دل کی سچائی یہ ہے کہ جو بات زبان سے کہی

جا رہی ہے وہ بات دل میں بھی ہو اس لئے کہ بعض دفعہ زبان سے صحیح بات کا اظہار جھوٹ ہو جاتا ہے اگر دل اس کی صحت پر مطمئن نہیں ہے عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو بھی عمل ہو وہ دل اور ضمیر کے مطابق ہو۔ اسی لئے حق کا اعلیٰ معیار یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن میں یکسانیت ہو یعنی دل کا ہر ارادہ، عمل کی ہر جنبش اور زبان کا ہر جملہ نہیں بلکہ ہر حرف حق کا مکمل مظہر بن جائے۔

خدا کی مخلوقات میں انسان سب سے اشرف اور افضل ہے۔ اسی لئے اس سے حق پر استقامت مطلوب ہے جب حق پر استقامت نصیب ہوگی تو حق گوئی اور اعلان حق آسان ہو جائے گا اور مخالفت کے بھڑکتے ہوئے شعلے کے درمیان اظہار حق اور اعلان حق میں کسی قسم کا باک نہ ہوگا۔ یمن میں حضرت عیسیٰؑ کی امت کے کچھ مخلص اور پختہ مسلمان تھے مخالفین نے انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیں اور اخیر میں گڑھا کھود کر ان کو آگ میں جھونک دیا گیا مگر انہوں نے اعلان حق اور حق گوئی میں کسی مداہنت سے کام نہیں لیا جب پیارے نبی ﷺ کے چچا ابو طالب نے آپ ﷺ سے کہا اے بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میری استطاعت سے باہر ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا چچا جان اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں حق کی صدا لگانے سے باز نہ آؤں گا۔

انسان کو عموماً آٹھ چیزیں جو سر فہرست ہیں۔ حق گوئی سے باز رکھتی ہیں وہ یہ ہیں۔ خوف، حیا، قرابت، دشمنی، جذبہ ترحم اور ذاتی نفع ونقصان، مرعوبیت اور وقتی مصلحت ۔لیکن ان تمام چیزوں کو حق گوئی کی راہ حائل کرنا دینی اور سماجی جرم ہے۔ اس کائنات کے مالک کا ہم سے مطالبہ یہ ہے کہ حق گوئی اور حق پرستی کی راہ میں ذاتی نفع ونقصان قرابت داروں کی قرابت، محتاجوں کے لئے جذبہ ترحم اہل ثروت اور صاحب اقتدار کی دولت وخوف آڑے نہ آئے وہی عمل کریں جو حق ہو اور وہی بات کریں جو حق ہو۔ حق کو توڑ مروڑ کر پیش نہ کریں کہ سننے والا شک

میں پڑ جائے یا حق کا مکمل اظہار نہ کیا جائے بلکہ کچھ بات کہی جائے کچھ چھپا لی جائے کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر اظہار حق سے پہلوتہی کرنا ایسا ہی ہے جیسے بھیڑیئے پر ترس کھا کر اسے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے۔ اسی طرح کسی شخص کی دینی یا دنیاوی حیثیت ومنصب سے مرعوب ہو کر اظہار حق سے گریز بھی ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ حیا کا فطری وصف قابل تعریف ہے لیکن یہ فطری وصف اس وقت مضرت رساں اور قابل نفرت ہو جاتا ہے جب اس میں بزدلی کا عنصر شامل ہو جائے اور انسان بہت سارے اجتماعی اور انفرادی عمل سے حیا میں بزدلی کا عنصر شامل ہو جانے کی وجہ سے رک جائے۔ اس لئے حق گوئی اور اظہارِ حق کے موقع پر شرم وحیا اور بزدلی کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ عداوت اور دشمنی کی بناء پر بھی حق گوئی سے گریز کرنا قابل نفرت عمل ہے اللہ کے پاک کلام میں ہے کہ ''لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم کے ارتکاب پر آمادہ نہ کرے کہ حق کا دامن چھوڑ دو، حق پرست بنو، وہ پرہیز گاری سے قریب تر ہے'' (مائدہ۔۲)

پیارے نبی ﷺ نے فرمایا ''سچ بولنا نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف اور جھوٹ بولنا برائی کی طرف لے جاتا ہے اور برائی جہنم کی طرف۔ آپ ﷺ نے فرمایا کسی کو اگر کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے اس کو انسانوں کا خوف مانع نہیں ہونا چاہئے۔ ایک بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہ اس کو ہمارے بارے میں ایک حق بات کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے ایسے شخص سے خدا قیامت کے روز کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں بات کہنے سے کس چیز نے روکا، وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف۔ ارشاد ہوگا تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہئے تھا۔ آپ ﷺ

نے فرمایا بہترین جہاد ظالم صاحب اقتدار کے سامنے حق گوئی ہے۔ اس لئے حق کے اظہار میں نہ کسی کا خوف ہونا چاہئے اور نہ ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا۔

اس لئے جو شخص کسی مصلحت، خوف، قرابت، عداوت، ذاتی منفعت، مرعوبیت، حیا اور جذبہ ترحم کے نتیجہ میں حق کے برملا اظہار کے بجائے حق کو چھپاتا اور اس کو بے نقاب کرنے کے بجائے اس کی پردہ پوشی کرتا ہے اس کی صورت مسخ کرتا ہے وہ شخص پوری دنیا کو فریب اور دھوکا دیتا ہے ایسے شخص میں دنیا کی دوسری جو بھی برائیاں ہوں کم ہیں۔ کیونکہ اس نے اسی آئینہ شفاف کو چکنا چور کر ڈالا ہے جس میں حق وصداقت کا چہرہ نظر آتا تھا۔

کتمان حق کی بدترین صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ جان بوجھ کر انسان انجان بن جائے۔ حق کا علم رکھ کر بھی اس کے اظہار سے باز رہے۔ ایسے شخص پر خدا کی لعنت برستی ہے اس سے ملک وملت اور سماج کے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہوتا ہے اور اجتماعی شیرازہ بندی کے بجائے پوری قوم انتشار اور انار کا شکار ہو جاتی ہے۔

آج جب کہ عقل کی قوت اور نیکی وحق گوئی کی استعداد کا چراغ، جذبات، مصلحت، ذاتی منفعت، قرابت، عداوت ودشمنی، حیا وبزدلی، رحمت وشفقت اور مرعوبیت کی آندھیوں میں بجھ رہا ہے ضرورت ہے کہ چراغ کی لو بڑھائی جائے اور کسی حقیقت کو صرف درست، بجا، صحیح اور سچ سمجھنے پر اکتفا کرنے کے بجائے برملا حق کے اظہار کی جرأت پیدا کی جائے۔ کیونکہ حق کسی فرد، کسی جماعت، کسی مذہب، کسی قوم اور کسی نسل کی جاگیر نہیں اور نہ ہی یہ کسی کے عروج وزوال اور زماں ومکاں کے حدود وقیود سے وابستہ ہے، بلکہ حق کا ساتھ ہمیں اس لئے دینا ہے کہ وہ حق ہے اور حق کا اظہار اس لئے کرنا ہے کہ وہ حق ہے اور حق کو غالب اس لئے کرنا ہے کہ حق غالب ہی ہونے کے لئے آیا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں وہ

اس کا زیادہ مستحق ہے بلکہ سب سے زیادہ مستحق ہے بلکہ صرف وہی مستحق ہے۔

آج جب کہ حق گوئی کی جگہ مداہنت، نفاق اور دروغ گوئی لے رہی ہے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ حق کو اس کا صحیح مقام دیا جائے اور اس کو اس کا صحیح مقام اسی وقت ملے گا جب ہم حق گو بنیں۔ اور حق گوئی کے لئے ماحول کو سازگار بنائیں۔ اور حق کی حقانیت کو معاشرہ میں عام کریں اور اس راہ میں پیش آنے والے روڑے اور کسی قسم کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں تاکہ حقدار کو اس کا جائز حق ملے اور حق کو اس کا صحیح مقام۔

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

عید الفطر محبت و ہمدردی کا درس

(تاریخ نشر ۱۴/ مارچ ۱۹۹۴)

زمان و مکان کی خصوصیت ہر دور ہر مذہب اور ہر فلسفہ اخلاق میں مسلّم رہی ہے اور اس کی بنیاد پر بڑے بڑے نمایاں اور عظیم الشان امور انجام دیئے جاتے رہے ہیں جن کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا اسلام میں جس طرح دنوں میں جمعہ کو اور راتوں میں شب قدر کو ایک مخصوص خصوصیت حاصل ہے اسی طرح مہینوں میں ماہ رمضان کو وہ بلند و بالا مقام حاصل ہے جس سے دوسرے مہینے تہی دامن ہیں۔ اسی ماہ رمضان کے روزے شعبان ۲ھ میں مدینہ منورہ میں مسلمانوں پر فرض کئے گئے۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

"اے ایمان والو تم پر رمضان کے روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو"۔ (البقرہ ۱۸۳)۔

رمضان کے روزے کی اہمیت پر اس حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس کی روایت حضرت ابوہریرہؓ نے کی ہے:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ انسان کا ہر عمل اس کے لئے ہے لیکن روزہ ایک ایسا عمل ہے جو خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دونگا اور روزہ لغو چیزوں سے روکنے کی ڈھال ہے اگر تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فحش کلامی سے پرہیز کرے۔ نہ بیہودہ گوئی کرے اور نہ جھگڑے۔ اگر کوئی اس کو برا بھلا کہے یا جھگڑا کرنے پر آمادہ ہو جائے تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں اور قسم ہے اس کی

جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کو مشک سے زیادہ پسند ہے۔ روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں ایک افطار کے وقت جب کہ وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری خوشی قیامت کے دن ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملے گا اور اپنے روزہ کا بدلہ دیکھے گا''۔(بخاری و مسلم)۔

دوسری حدیث میں ہے کہ:

''آدمی کو ہر عمل کے بدلے میں دس نیکیاں سات سو گنا تک دی جائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ تو خاص میرے لئے ہے میں ہی اس کا بدلہ دونگا اس لئے کہ اس کا کھانا پینا چھوڑنا اور خواہش کا ترک کرنا میری خاطر تھا''۔(مسلم)

اسلام نے اس مبارک ماہ کے روزے کے روحانی تصور کو ایک مکمل اور افراط و تفریط کی شاہراہ سے ہٹا کر ایک معتدل قالب میں پیش کیا اور عزلت وتنہائی کی زندگی سے نکال کر زندگی کی دوڑ میں لا کر پاکیزگی کے خلعت سے سرفراز کر کے اجتماعی، اَخلاقی، روحانی اور معاشرتی تربیت کی اہمیت کا حامل قرار دیا۔

روزہ کا اصل مقصد تقویٰ کی صفت پیدا کرنا ہے۔تقویٰ کی حقیقت کے بارے میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے دریافت فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا آپ کانٹوں بھرے راستے سے گذرے ہیں انہوں نے کہا ہاں! پوچھا اس وقت آپ نے کیا کیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا اپنا دامن سمیٹ لیا اور بچتے بچاتے وہاں سے گذر گیا حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا بس اسی کا نام تقویٰ ہے۔روزہ سے تقویٰ کی صفت پیدا ہو اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے اہتمام ہوتا کہ اس صفت کے پیدا ہونے کی راہ میں اگر کوئی چیز حائل ہو رہی ہو تو دور کر دی جائے اور چوں کہ نفس انسانی کو تقویٰ کی راہ سے دور کرنے میں سب سے اہم رول

شیطان کا ہوتا ہے۔اس لئے اس ماہ میں شیاطین پابہ زنجیر کر دیئے جاتے ہیں۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو بہشت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین پابند سلاسل کر دیئے جاتے ہیں''۔(مشکوٰۃ)۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں

''دنیا میں جب کسی معزز آدمی کی آمد ہوتی ہے تو مفسدوں کو خاص طور پر نظر بند کر دیا جاتا ہے پس رمضان میں خاص برکات وتجلیات کی آمد کے موقع پر بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے اور پھر بھی جو گناہ ہوتے ہیں وہ نفس کے سبب ہوتے ہیں۔''(احکام اسلام عقل کی نظر میں۔ص ۱۵۵)۔

اس وقت دنیا میں رنگ ونسل اور دین ومذہب کے اختلافات کے باوجود جتنی بھی قومیں آباد ہیں کسی نہ کسی شکل میں ان میں تہوار منانے کا رواج ضرور ہے گویا سماجی زندگی اور تہوار میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ تہوار معاشرہ کی شیرازہ بندی اور اس میں اجتماعی روح پیدا کرنے اور اس میں وقفہ وقفہ سے تازگی پیدا کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

اسلام میں صرف دو تہوار ہیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ ماہ شوال کی پہلی تاریخ کو عید الفطر کہتے ہیں اور ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو عید الاضحیٰ۔ یہ دونوں دن اسلام میں عید اور خوشی کے دن ہیں۔عربی زبان میں فطر کہتے ہیں روزہ کھولنے کو۔تو عید الفطر کا مطلب ہوگا روزہ کھولنے کی عید۔یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے جذبات، بھوک اور پیاس سے رکے رہنے کے انعام میں اللہ تعالیٰ نے خوشی کا یہ دن عنایت فرمایا۔

عید الفطر محبت کا پیغام دیتی ہے اسی لئے شریعت نے جذبہ محبت وغم خواری کی تکمیل کیلئے صدقہ فطر کو واجب قرار دیا ہے تاکہ ایک بے یار، غریب، مفلس، نادار، یتیم، بے سہارا، بیوہ، بے کس، بے بس، بے نوا، اور مفلوک الحال بھی اس عظیم الشان دن کی خوشی میں شریک

ہو سکے۔ اسی لئے اسلام نے معاشی طور پر بے سہارا لوگوں کی امداد کو خوش حال طبقہ کیلئے ضروری قرار دیا ہے تا کہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آسکے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ (مشکوٰۃ باب الشفقہ والرحمۃ علی الخلق)۔

اسی لئے اللہ کا محبوب بندہ وہ ہے جو دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دے۔ حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو ایک مرتبہ بکری کی سری بہ طور ہدیہ ملی۔ انہوں نے دوسروں کو زیادہ حاجت مند خیال کر کے ان کے یہاں بھیج دی اس نے تیسرے کے پاس بھیج دی اس طرح بکری کی یہ سری دوسروں کے پاس پہونچتی رہی اور سات گھروں کا چکر کاٹنے کے بعد پہلے صحابی کے پاس واپس آگئی۔ (احیاالعلوم ج ۲ ص ۱۷۴)۔

اسی معاشی تکفل کے احساس کا ایک واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نیک سیرت بیوی فاطمہ نقل کرتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ :

''ایک بار میں آپ کے پاس گئی آپ جائے نماز پر تھے اور آنسو ٹپک ٹپک کر داڑھی کو تر کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کیا بات ہوگئی۔ آپ نے فرمایا میں نے پوری امت محمدیہ کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے لہذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بکثرت اہل وعیال والے ہیں مگر مالدار نہیں قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان سب کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میں میرے مقابلے میں ان لوگوں کے وکیل محمد ﷺ ہوں گے مجھے ڈر ہے کہ جرح میں میرا عذر ثابت نہ ہو سکے گا اس لئے میں اپنے اوپر ترس کھا کر رونے لگا۔ (ابن الاثیر الکامل جلد ۵ ص ۲۴)۔

مشہور واقعہ ہے کہ ابن طفیل نے ایک دن خوش ہو کر لوگوں کو بتایا کہ اے لوگو! میں نے وہ راز پالیا جس سے انسانی معاشرہ، خوش وخرم رہ سکتا ہے۔ ایک دوست نے دریافت کیا کس طرح! ابن طفیل نے جواب دیا، کائنات کی ہر شئے دوسروں کے لئے ہے۔ درخت اپنا پھل نہیں کھاتا۔ دریا اپنا پانی نہیں پیتا۔ یہ بہاریں، یہ برساتیں، یہ نغمے یہ زمزمے سب دوسروں کے لئے ہیں پس وہی زندگی نظام کائنات سے ہم آہنگ ہوسکتی ہے جو دوسروں کے لئے ہو۔

اسی طرح عیدالفطر مساوات کا پیغام دیتی ہے۔ امیر وغریب، بادشاہ ورعیت اعلیٰ ادنیٰ، چھوٹا بڑا، پڑھا لکھا اور ناخواندہ اور کالا گورا صف بستہ ہو کر رنگ ونسل وطن اور جاہ وحشم کے سارے امتیازات کو بالائے طاق رکھ کر ایک خدا کے حضور شکر کے طور پر دوگانہ ادا کرتے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے

مساوات کی ایک جھلک کا اظہار پانچ وقت کی نمازوں میں اس سے زیادہ جمعہ کے دن اور اس کا مکمل اظہار عیدالفطر کے دن ہوتا ہے۔

عیدالفطر محبت اور مساوات کا پیغام ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس پیغام مساوات محبت کی یاد کو تازہ رکھیں اور محبت ومساوات کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں اور بارگاہ ایزدی میں یوں دعا کریں کہ۔

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

مقدس کتابوں کی روشنی میں : تعلیم کی اہمیت

(تاریخ نشر ۲ر دسمبر ۱۹۹۴)

تعلیم اور مذہب میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد اور اساس تعلیم ہی ہے اگر مذہب کا مقصد انفرادیت کی بالیدگی، خودی کی تکمیل، ہم آہنگی کے ساتھ شخصیت کی ہمہ جہت ترقی، حیات و کائنات میں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کیلئے ایسی ذہنی اور علمی استعداد کو کہ وہ اپنی ذات کا تحفظ کر سکے، اوقات کو ضائع ہونے سے بچا سکے، سماجی منافرت کو ختم کر سکے، سیرت و کردار اور اخلاق کی آراستگی مثالی انسانیت کی تکمیل، جسم انسانی میں نہاں قوت کی تربیت، پاک وصاف زندگی بسر کرنے کی قابلیت اور اس کائنات کے پیدا کرنے والے کی کما حقہ عبادت ہے تو ان تمام مقاصد کی تکمیل بغیر تعلیم کے ممکن نہیں ہے تعلیم انسان کو مہذب، شائستہ اور صاحب کردار بناتی ہے اور یہی وہ اوصاف ہیں جو انسان کو اپنے ہم جنسوں میں ممتاز مقام کا حامل بناتے ہیں۔ اسی لئے مذہب واضح الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟

ہر دور میں دنیا کے تمام مذاہب میں تعلیم کو ایک منفرد مقام حاصل رہا ہے۔ تعلیم پر عمل کرنے اور اس پر عمل پیرا نہ ہونے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک تمثیل کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں: پس جو کوئی میری یہ باتیں سنتا اور ان پر عمل کرتا ہے وہ اس عقل مند آدمی کی مانند ٹھہرے گا جس نے چٹان پر اپنا گھر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا اور آندھیاں چلیں اور اس گھر پر ٹکریں لگیں لیکن وہ نہ گرا کیوں کہ اس کی بنیاد چٹان پر ڈالی گئی تھی اور جو کوئی میری یہ باتیں سنتا ہے اور ان پر عمل نہیں کرتا وہ اس بے وقوف آدمی کی مانند ٹھہرے گا جس نے اپنا گھر

ریت پر بنایا اور مینہ برسا اور پانی چڑھا اور آندھیاں چلیں اور اس گھر کو صدمہ پہنچایا اور وہ گر گیا اور بالکل برباد ہو گیا۔ (متی ب ۷، ۲۴۔۲۸)۔

انجیل میں دوسری جگہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے گیارہ شاگردوں کو یہ فہمائش کی کہ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو تعلیم دو کہ ان سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تم کو حکم دیا۔ (متیٰ ب ۲۸۔۱۹۔۲۰)۔

بدھ مذہب میں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس مذہب کے مقرر کردہ آٹھ اصولوں سے لگایا جا سکتا ہے کیونکہ ان آٹھ اصولوں کا علم اور زندگی میں اس کا نفاذ بغیر تعلیم کے ممکن نہیں۔ وہ آٹھ اصول یہ ہیں: سچا علم، سچے خیالات، سچی زبان، سچی خدمت، سچی کوشش، سچی نظر، سچا برتاؤ اور سچا جذبہ۔

اسی طرح جین دھرم کے پانچ اصولوں کا تعلق بھی تعلیم ہی سے ہے اس لئے کہ تعلیم کے نتیجے ہی میں یہ اصول لوگوں تک پہونچے اور ان سے لوگوں کو واقفیت ہوئی وہ اصول یہ ہیں: ہمیشہ سچ بولو، لالچ مت کرو، چوری مت کرو، کسی ذی روح کو مت ستاؤ، اپنی خواہشات کو مار کر زندگی گزارو۔

سکھ مذہب کے جو نو بنیادی اصول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ گناہ گار وہ ہیں جنہوں نے حدود الٰہی کو توڑا۔ اس اصول سے سکھ مذہب میں تعلیم کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ جب تک حدود الٰہی معلوم نہ ہوں حدود الٰہی ٹوٹتے رہیں گے۔ حدود الٰہی نہ ٹوٹیں اس کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کے ذریعہ حدود الٰہی کے خط و خال کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔

مذہب اسلام میں علم اور تعلیم کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس کی ابتداء ہی تعلیم سے ہوتی ہے ''پڑھو اپنے رب کے نام

سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسانوں کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کرم کرنے والا ہے اس نے علم سکھلایا قلم کے ذریعہ، اور انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔ (العلق۔۱۔۵)۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے ارشاد گر یا نادار، نوجوان ہو یا سن رسیدہ، بادشاہ ہو یا رعیت، کالا ہو یا گورا، عربی ہو یا عجمی، صاحب جاہ وحشم ہو یا لاچار و بوریہ نشیں تعلیم کو ضروری قرار دیا۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''**طلب العلم فریضة علی کل مسلم** ''تعلیم کا حصول ہر مسلمان پر (مرد عورت) فرض ہے۔ (مسلم)

اسلام میں زندگی کا کوئی بھی مرحلہ حصول علم سے مانع نہیں ہے بلکہ اسلام کا حکم یہ ہے ''اطلبوا العلم من المھد الی اللحد''، یعنی علم سیکھو جس کی ابتداء گود سے ہوگی اور جس کی انتہا گور پر ہوگی۔

اسی طرح لمبی مسافت بھی اسلام کے نزدیک رکاوٹ نہیں ہے اسلام کا حکم ہے کہ علم سیکھو چاہے دور دراز کا ہی سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسی لئے قرآن کریم میں عالم اور جاہل میں فرق کیا گیا ہے ارشاد ہے'' کہہ دیجئے بھلا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھتے دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں (الزمر ۹)''۔

حضرت زبیر بن ابو بکر کہتے ہیں کہ ان کے والد نے انہیں یہ نصیحت لکھ کر بھیجی کہ:
''علم کی تحصیل تم پر فرض ہے اسلئے کہ اگر تم مفلس ہو گئے تو علم تمہاری دولت ہوگا اور اگر تم مالدار ہو گئے تو علم تمہارے جمال وجلال میں اضافہ کا سبب ہوگا''۔

حضرت ابو درداء فرماتے ہیں کہ اگر میں ایک مسئلہ کی تعلیم حاصل کروں تو یہ میرے

نزدیک رات بھر نفل نماز پڑھنے سے افضل ہے۔

حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد طلب علم سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں۔

نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں بُعثت معلما اور قرآن کریم میں حضور اکرم ﷺ کی اس صفتِ معلّمی کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔ (آلِ عمران ۱۱۶)

تعلیم کی اہمیت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں لیکن اگر آج ہم اپنے گردوپیش اور ملک کا جائزہ لیں تو تعلیمی میدان میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ میں ہم اپنے آپ کو بہت پیچھے پاتے ہیں اور اس کی شاید سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نظریاتی طور پر ہم تعلیمی اہمیت کے قائل ہیں لیکن عملی طور پر تعلیم کو جو اہمیت دینی چاہئے تھی ابھی تک ہم نہیں دے پا رہے ہیں۔ اس کے اسباب چاہے جو بھی ہوں لیکن بہر حال تعلیم سے دوری اور ناخواندگی کے جو نتائج ہوتے ہیں ان کا ہم روزانہ مشاہدہ کر رہے ہیں۔ جب تک تعلیم عام نہیں ہوجاتی اس وقت تک ایک اچھے صحت مند اور مثالی سماج کا وجود شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ ایک تعلیم یافتہ شخص ہی اپنے خاندان کا ایک اچھا فرد، اپنے معاشرہ کا ایک اچھا مربّی اور اپنے ملک کا ایک اچھا شہری ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی کے اندر مقاصد و وسائل میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ جب ذہنی اور فکری لحاظ سے ایک اچھا انسان ہوگا تو بجا طور پر اس سے یہ توقع کی جاسکے گی کہ وہ انسانیت کی تعمیر اور شخصیت سازی میں نمایاں رول ادا کر سکے۔ اس کے دل بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کے جذبات سے لبریز ہونگے۔ میدانِ کارزار ہو یا بزمِ عیش

وطرب وہ پاک نگہہ اور پاکباز ہوگا وہ گفتگو میں نرم، خرام اور جستجو میں سبک گام ہوگا۔ جس طرح اس کے سامنے اپنے حقوق ہونگے، اسی طرح اس کے سامنے اپنے فرائض بھی ہونگے۔ اس کی نگاہیں دور بین اور دور رس ہونگی اور وہ حالات کے نشیب و فراز کا نباض ہوگا۔

غرض تعلیم انسان کو اچھا انسان بناتی ہے اس میں بھائی چارہ اور اخوت کے اوصاف پیدا کرتی ہے، اس میں یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آسکے۔ آپسی میل جول اور اپنے بے لوث سلوک کے ذریعہ ایسا معاشرہ تشکیل دے سکے جہاں دشمنی، عداوت، منافرت اور انتقام کے جذبات سرد پڑ جائیں۔ ہر شخص دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دے۔ دوسروں کے آرام وآسائش کی خاطر اپنے مفادات کی قربانی دے۔ رنگ ونسل اور دین و مذہب کی تفریق کے بغیر انسانیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے اچھا سلوک کرے۔ چاہے اس کے نتیجے میں اسے بڑی سے بڑی چیز کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک ترقی کرے۔ اسے استحکام نصیب ہو اور ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے تو ہمیں تعلیم کو عام کرنا ہوگا۔ اور اس راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ اسی وقت ہم حقیقی ترقی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں ورنہ تعلیم کی صرف نظریاتی اہمیت کو تسلیم کرلینا اس درد کا درماں نہیں ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہؓ ایک مثالی خاتون

(تاریخ نشر ۱۷رفروری ۱۹۹۵)

اس عالم آب وگل میں ہر مخلوق چاہے وہ عقل وشعور کی صلاحیت سے بہرہ مند ہو یا اس سے بے بہرہ ہو، چاہے اس کا تعلق انسان سے ہو یا حیوان سے، نباتات سے جمادات سے، ہر ایک میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے جو اس صنف کو دوسری صنف سے ممتاز کرتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہر صنف کی خصوصیات اور صلاحیتوں کا فرق ہی اس کائنات کی زینت کا سبب ہے۔ ذوقؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

عورت اور مرد دو اصناف ہیں۔ جس طرح مردوں کے کارناموں، ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور ان کی ناقابل فراموش خدمات سے تاریخ کے زریں صفحات تابندہ ہیں، اسی طرح صنف نازک کے کارہائے نمایاں، ان کے ایثار، ان کی علمی خدمات، ان کی خدا ترسی، ان کی داد و دہش، علوم وفنو[illegible] ان کا شغف، حالات و واقعات سے باخبری، معاملہ فہمی، نازک ترین حالات میں ان کے فیصلہ کی قوت، دقتِ نظری، ژرف نگاہی، خود آگاہی، خدا آگاہی، ان کی فکری گیرائی و گہرائی اور زندگی کے مختلف میدان میں ان کے درخشندہ کارنامے آج بھی جبین تاریخ نہیں بلکہ جبینِ انسانیت کا طرہ امتیاز ہیں۔ اسی لئے تاریخ تمدن سے واقف جہاندیدہ اقبالؔ کو اعتراف کرنا پڑا کہ

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی ، لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

ام المومنین حضرت عائشہؓ اپنی ذات سے انجمن تھیں۔انہوں نے زندگی کے قیمتی لمحات کوعطیہ خداوندی بلکہ امانتِ خداوندی سمجھ کرحقوق اللہ اورحقوق العباد کی ادائیگی میں صرف کر کے ایک مثالی زندگی کا اسوہ اورنمونہ قیامت تک کیلئے خواتین کے لئے چھوڑا ہے جس پر عمل کر کے آج بھی خواتین مثالی خواتین کا روپ اختیار کرسکتی ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا علمی مقام بہت اونچا تھا۔ان کے ذہن رسا اور تفوقِ علمی کے تمام معاصرین قائل تھے۔سن رسیدہ اشخاص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اوراپنے مسائل اورذہنی خلش کوآپ کے سامنے پیش کرتے اورآپ ان کی خلش کودور کرتیں اوران کے مسائل کا تشفی بخش جواب دیتی تھیں۔حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ آپ کو یہ علمی مقام کس طرح حاصل ہوا،آپ نے جواب میں فرمایا کہ میری عادت تھی کہ جب بھی میرے ذہن میں کوئی سوال یااشکال پیدا ہوتا تو میں خاموش رہنے کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیتی۔

سوال کی کثرت علم میں اضافہ کا سبب ہوتی ہے۔اس لئے ہماری ماؤں اور بہنوں کو چاہئے کہ جومسائل ان کومعلوم نہ ہوں وہ معلوم کرنے کی کوشش کریں تا کہ عمل بھی کرسکیں اور ان کی قابلیت اُور علمی لیاقت میں اضافہ بھی ہو۔

حضرت عائشہؓ کی روسری نمایاں خصوصیت ان کا جود وسخا تھی۔ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ہدیہ کے طور پر بہت بڑی رقم آئی جس کی مالیت آج سے پندرہ سوسال پہلے ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔رقم کے آتے ہی آپ نے تقسیم کرنا شروع کردیا تھوڑی دیر میں پوری رقم ختم ہوگئی۔حضرت عائشہؓ اس دن روزہ سے تھیں جب شام ہوئی تو باندی سے فرمایا کہ افطاری لاؤ چنانچہ وہ زیتون کا تیل اورروٹی لے کرآئی۔وہاں امّ درہ نامی عورت بھی موجود تھی اوروہ بھی روزہ سے تھی اور داد ودہش کی یہ کیفیت دیکھ رہی تھیں۔انہوں نے عرض کیا آپ نے جو مال تقسیم کیا ہے اس میں سے اتنا بھی آپ نہ کرسکیں کہ ایک درہم کا گوشت ہی منگا لیتیں جسے افطاری میں ہم کھاتے۔حضرت عائشہؓ نے سن کرفرمایا کہ اب کہنے سے کیا فائدہ۔اس وقت تم یاددلاتیں تو میں اس کا خیال کرلیتی۔

حضرت عروہؓ اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے ایک روز ستر ہزار درہم ضرورت مندوں میں تقسیم فرمادیئے اوراپنا حال یہ تھا کہ تقسیم کرنے کے وقت اپنے کرتے میں پیوند لگا رہی تھیں۔

آپ کی تیسری نمایاں خصوصیت زہد وقناعت کی زندگی تھی۔فرماتی ہیں کہ ہم تین چاند دیکھ لیتے تھے اور ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔کھجور اور پانی پر گذارہ کرلیتے تھے۔گھر میں چراغ تک نہیں جلتا تھا۔

شعراورطب سے بھی آپ کو لگاؤ تھا۔عرب کے واقعات اہل عرب کے نسب اور اشعار حضرت عائشہ کو کثرت سے یاد تھے۔مختلف بیماریوں کے علاج سے متعلق طریقوں اور دواؤں کا بھی آپ کو علم تھا۔جس کے ذریعہ آپ علاج کرتی تھیں۔

کاروباری حضرات بھی آپ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔حضرت نافع فرماتے ہیں

کہ میں شام اور مصر مال لے جا کر تجارت کرتا تھا۔ ایک مرتبہ میں تجارت کے ارادے سے عراق اپنا مال لے گیا واپس آ کر حضرت عائشہ کے پاس گیا اور سارا واقعہ بیان کیا۔ واقعہ سن کر حضرت عائشہ نے فرمایا کیوں بلاوجہ اپنی سابقہ تجارت گاہ چھوڑتے ہو۔ ایسا مت کرو۔ کیونکہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کسی ذریعہ سے رزق کے اسباب پیدا فرمادے تو جب تک خود ہی وہ سبب کسی وجہ سے نہ بدل جائے اس کو نہ چھوڑو۔

ایثار و قربانی اور دوسروں کی ضرورت کی تکمیل آپ کی زندگی کا شعار رہا۔ اور اس سے ان کو ایک طرح کا سرور اور لذت حاصل ہوتی تھی۔ جو آج کے دور میں ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک کُرتا تھا جو مدینہ میں ہر شادی کے وقت دلھن کو سجانے کیلئے مجھ سے مانگا تھا اور پھر رخصتی کے بعد واپس کر دیا جاتا تھا۔

لوگ دور دور سے آپ کے پاس آتے اور مسائل معلوم کرتے تھے اسی طرح بہت سے لوگ خطوط لکھ کر حضرت عائشہ سے دینی معلومات حاصل کرتے تھے اور حضرت عائشہؓ خطوط کے ذریعہ انکے مسائل کا جواب دیتی تھیں۔

خوفِ خدا اور فکر آخرت آپ کو ہمیشہ لرزاں و ترساں رکھتی تھی۔ ایک بار رو رہی تھیں۔ سبب دریافت کیا گیا تو فرمانے لگیں کہ مجھے دوزخ کا خیال آ گیا تھا اس لئے رو رہی ہوں۔

پند و حکمت کے کلمات بھی حضرت عائشہؓ سے نقل کئے گئے ہیں۔ فرماتی تھیں کہ پہلی خرابی جو اس امت میں پیدا ہوئی وہ یہ ہیکہ لوگ پیٹ بھر کر کھانے لگے۔ جب پیٹ بھرتے ہیں تو بدن موٹے ہو جاتے ہیں اور دل کمزور ہو جاتے ہیں اور نفسانی خواہشات زور پکڑ لیتی ہیں۔

جو شخص اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کو خوش رکھنا چاہتا ہو اللہ تعالیٰ اس کی مدد نہیں

فرماتا بلکہ اس کو لوگوں کے حوالے فرمادیتا ہے اور لوگ اس کے ساتھ جس طرح معاملہ کرنا چاہتے ہیں معاملہ کرتے ہیں اور جو شخص لوگوں کی ناراضگی کا خیال نہ کرتے ہوئے اللہ کی رضا کا طالب ہوتا ہے اس کائنات کا مالک اس کو لوگوں کی نازیبا حرکات سے محفوظ فرمادیتا ہے۔

اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کی مثالی سیرت کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا گیا۔ اس خاکہ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہوتی ہیکہ آپ ایک مثالی سیرت کی مالک تھیں۔ علم و تفقہ، جود و سخا، ایثار و قربانی، صبر و قناعت اور ان جیسی صفات آپ کی زندگی کا طرہ امتیاز تھیں۔

آج جب کہ یہ چیزیں عنقا ہوتی جا رہی ہے اور ان صفات کے حامل انسان کو از کار رفتہ تصور کیا جانے لگا ہے۔ حالانکہ تصورات کے بدل جانے سے حقائق نہیں بدلا کرتے ہیں۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان تصورات کے خلاف صحیح تصور کو اپنی زبان، اپنے قلم اور اپنے عمل سے عام کریں تاکہ صحیح تصورات غلط تصورات کی جگہ لیں اور ہمارے معاشرہ کو جس علم و تفقہ، جود و سخا، ایثار و قربانی اور صبر و قناعت کی ضرورت ہے وہ عام ہو اور ہمارا معاشرہ اور خاص طور پر ہماری مائیں اور بہنیں ان صفات سے آراستہ ہوں جن کا عملی نمونہ حضرت عائشہؓ نے چھوڑا ہے۔ اسی کو انہوں نے اپنی زبان، اپنے عمل اور اپنے قلم کے ذریعہ عام کرنے کی کوشش کی۔

ہمارے معاشرہ میں اگر یہ چیزیں عام ہونگی تو ایک اچھی سوسائٹی وجود میں آئیگی اور ماں کی آغوش میں پروان چڑھ کر بچے جب صالح معاشرہ کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کریں گے تو ان ہی خطوط پر عمل کریں گے جن کو انہوں نے اپنی مثالی ماں کی مثالی سیرت سے اخذ کیا ہوگا۔ ملک و ملت کی بہتری اور کامیابی اسی نکتہ میں مضمر ہے۔ کاش کہ یہ نکتہ عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بن جائے۔

منگل کے دن ۱۷ رمضان المبارک ۵۸ھ میں حضرت عائشہؓ اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اسوہ پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

شہادت امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ

(تاریخ نشر ۱۹؍مئی ۱۹۹۵)

تاریخ، اسلاف کی زندگی، ان کے کارناموں اوران کے بے مثل کردار کا مکمل اور واضح عکس ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔اسی لئے تاریخ اسلاف سے واقفیت اوران کے تابندہ اور درخشندہ نقوش کو میدان عمل میں اپنی تگ و دو کا محور بنانا زندہ قوم کی علامت سمجھی جاتی ہے۔کوئی قوم یا فردوز مانہ کے حالات وواقعات، اس کے نشیب وفراز اوران میں رونما ہونے والے رجحانات ومیلانات سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ایک زندہ قوم میں یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ حالات کو پڑھ سکے، ان کے مضمرات کو سمجھ سکے اوران پر مرتب ہونے والے نتائج کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرسکے۔

حضور اکرم ﷺ کی بعثت تاریخ کا ایک سنہری باب ہے جس نے تاریخ کو نئی تہذیب، نئے تمدن اور ایک اچھوتے پیغام سے روشناس کرایا جس سے انسانیت کو نئی زندگی، نئی روح، نئی حرارت اور تابندگی بلکہ پائندگی ملی۔حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ اورانکے بعد حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی۔دورِ فاروقی میں فتوحات کی کثرت سے سلطنت کے حدود وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے۔عجمیوں کی کثیر تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔اسبابِ تجارت وتمدن میں روز افزوں ترقی کے سبب، عُسرت وتقشّف کی جگہ فارغ البالی اور خوشحالی لینے لگی۔فتوحات کے نتیجہ میں تہذیبی دادوستد کا سلسلہ دراز ہوا۔ مختلف علاقوں کے وفود کی آمد کے سبب افکار وخیالات اور احساسات وتاثرات کو اثر اندازی اور اثر پذیری کے مواقع ملے۔فکری اور عملی تربیت کے جو مواقع اس سے پہلے میسر تھے۔اب سلطنت

کی وسعت اور سلطنت کے باشندوں کی کثرت اور ترسیلِ افکار کے ذرائع کے اختلاف کے سبب مختلف افکار نے ایک ناقابلِ نظر انداز شناخت حاصل کرلی تھی۔ان حالات میں حضرت عمرؓ کی شہادت کا دلدوز واقعہ پیش آیا اور ۲۴ھ میں صلاح ومشورہ کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔

حضرت عمر کے اخیر دورِ خلافت ہی سے حالات میں تبدیلی کے آثار پیدا ہوگئے تھے جو کسی مناسب وقت میں اپنے ظہور کے منتظر تھے۔

حضرت عثمانؓ کو اللہ تعالیٰ نے دینی دولت کے ساتھ دُنیوی دولت ووجاہت سے بھی نوازا تھا۔اسی لئے آپ عوام وخواص میں عثمان غنی کے نام سے مشہور ہیں۔عام طور پر جب دولت آتی ہے تو اپنے لوازمات کے ساتھ آتی ہے۔نخوت وتکبر، ہوس ناونوش اور لذت کام و دہن کے حصول میں انسان بسا اوقات اپنی اور اپنے خالق کی حقیقت کو فراموش کردیتا ہے۔اسی لئے یہ بات مشہور ہے کہ ”تو بہ دولت رسی ومست نہ گردی مردی“ یعنی جوان مردی کی بات یہ نہیں ہے کہ شراب نوشی اور بادہ پیمائی کے بعد انسان نشہ پر قابو پالے۔ بلکہ جوانمردی اور بہادری کی بات یہ ہیکہ دولت آنے کے بعد اس کے نشہ سے محفوظ رہے۔حضرت عثمانؓ ان ہی جوانمردوں میں سے تھے جو تونگری کے باوجود دولت کے نشہ سے محفوظ رہے۔

مدینہ منورہ میں پینے کے پانی کی قلت تھی۔ضرورت تھی ایسے شخص کی جو اپنے تیشہ دولت سے چشمہ آب جاری کرے اور آبِ شیریں سے اہالیانِ مدینہ کو سیرابی عطا کرے کیونکہ مدینہ میں صرف ایک ہی میٹھے پانی کا کنواں تھا جس کا نام رومہ تھا۔وہ ایک یہودی کی ملکیت تھا جس کا پانی وہ جس قیمت میں چاہتا بیچتا تھا۔حضرت عثمان ایک دردمند دل رکھتے تھے انہیں بھلا یہ کیسے گوارا ہوسکتا تھا کہ لوگ آبِ زلال سے محروم رہیں اوراس محرومی کی کسک اپنے دل میں

محسوس نہ کریں۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّ و بیاں

حضرت عثمانؓ نے رومہ کا کنواں خرید کر لوگوں کے لئے سیرابی اور اپنے دردمند دل کے لئے تسکین کا سامان بہم پہنچایا۔

آپ کی طبیعت میں تواضع اور حیاء کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک بار حضرت عثمانؓ درِ دولت پر حاضر ہوئے تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور فرمایا کہ میں ایسے آدمی سے کیوں نہ حیا کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔

دولت کی کثرت کے باوجود لباس میں سادگی تھی۔ حضرت عبداللہ ابن شداد کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو ان کے زمانہ خلافت میں جمعہ کے دن منبر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت جو لباس وہ پہنے ہوئے تھے اس کی قیمت چار پانچ درہم سے زائد نہ تھی۔

آپ کی عادت شریفہ تھی کہ اپنا کام خود انجام دیا کرتے تھے اور دوسروں کی راحت کا لحاظ رکھتے تھے۔ عبداللہ رومی سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ رات کو اٹھ کر وضو کا سامان خود کر لیا کرتے تھے کسی نے آپ سے کہا کہ اگر آپ کسی خادم کو جگا لیا کریں تو اس میں کیا حرج ہے؟ آپ نے فرمایا کہ آخر ان کیلئے بھی تو شب کا وقت آرام کے لئے ہے۔

آپ کو حضور اکرم ﷺ کی ذات سے والہانہ محبت تھی۔ اور وفات نبوی ﷺ کے بعد بھی آپ کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مدینہ منورہ کی سرزمین کو چھوڑ کر کسی اور مقام کا رخ کریں۔

خلافت کے اخیر زمانہ میں جب حالات ناساز گار ہو گئے اور مدینہ منورہ میں قیام کی صورت میں ہر وقت کسی ناگوار واقعہ کے پیش آنے کا اندیشہ تھا حضرت مغیرہ بن شعبہ نے آپ کی خدمت

میں تین رائیں پیش کیں۔ ان میں سے ایک رائے یہ تھی کہ آپ مدینہ منورہ چھوڑ کر ملک شام تشریف لے جائیں۔ وہاں حضرت معاویہ موجود ہیں وہ آپ کی مدد کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ ملک شام کی طرف جانا میرے لئے ناممکن ہے کیونکہ مجھے یہ گوارہ نہیں کہ میں اپنی ہجرت کی جگہ اور رسول خدا کی ہمسائگی کو ترک کردوں۔

خدا کی راہ میں دولت کا نذرانہ پیش کرنا ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن خباب روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ صحابہؓ کو راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دے رہے تھے حضرت عثمانؓ نے عرض کیا کہ میں سو اونٹ راہ خدا میں نچھاور کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے پھر صحابہ کو ترغیب دی۔ حضرت عثمانؓ نے کہا میں تین سو اونٹ کا نذرانہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے صحابہ کو پھر ترغیب دی تو حضرت عثمانؓ اپنے گھر تشریف لے گئے اور ایک ہزار اشرفیاں راہِ خدا میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

ایک بار مدینہ منورہ میں قحط پڑا، قحط اتنا سخت اور جان لیوا تھا کہ لوگ پریشان ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ملک شام سے حضرت عثمانؓ کے ایک ہزار اونٹ غلے سے لدے پھدے آئے۔ آمد کی خبر سن کر مدینہ کے تاجر حضرت عثمانؓ کے پاس غلہ کی خریداری کیلئے آپہنچے۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا کہ آپ حضرات کیا نفع دیں گے وہ لوگ آخر میں ڈیڑھ گنا نفع دینے پر راضی ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ مجھے اس سے بھی زیادہ نفع مل رہا ہے۔ تاجروں کو سخت تعجب ہوا ان لوگوں نے کہا کہ زیادہ دینے والا کون ہے؟ مدینہ کے تمام تاجر تو ہم ہی لوگ ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ: مجھے دس گنی زیادہ قیمت مل رہی ہے کیا آپ حضرات اس سے زیادہ دے سکتے ہیں؟ تاجروں نے انکار کر دیا تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کو گواہ بناتا

ہوں کہ میں نے یہ سب غلہ خدا کی راہ میں مدینہ کے غریبوں اور مسکینوں کو دے دیا۔

یہ واقعہ تازیانہ عبرت ہے ان تاجروں کے لئے جو ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ مصنوعی قلت پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بعثتِ نبوی سے پہلے عرب کے معاشرہ میں چوری، زنا، شراب نوشی اور ان جیسے امور کا ارتکاب عام تھا۔ یہ چیزیں نہ شرافت کے خلاف تصور کی جاتی تھیں اور نہ باعث ننگ و عار تھیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ جن کی طبیعت میں پاکیزگی اور فطرت میں سلامت روی اور خیر وشر میں فرق کرنے کی صلاحیت موجود تھی زمانہ جاہلیت میں بھی نہ انہوں نے کبھی شراب پی نہ ان سے زنا کا فعل سرزد ہوا نہ کبھی چوری کی، بلکہ تاریخ نے حضرت عثمانؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میرے دل میں کبھی بدی کی خواہش پیدا نہیں ہوئی بلکہ آخرت کی فکر اور رضائے الٰہی کے حصول کی خواہش اس قدر شدت سے موجود تھی کہ مسلمان ہونے کے بعد ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد فرماتے اور اگر کسی جمعہ کو غلام موجود نہ ہوتا تو اس کی قضاء فرماتے اس کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آپ نے نوے (۹۰) سال کی عمر پائی۔ عام طور پر جب آفتابِ عمر لبِ بام آنے لگتا ہے تو آدمی میں دولت کو سمیٹنے کا رجحان بڑھنے لگتا ہے اور جزرسی انسانی طبیعت میں گھر کرنے لگتی ہے۔

حضرت عثمانؓ کو اپنی ذمہ داری کا احساس تھا وہ سمجھتے تھے کہ ان کی اولین ذمہ داری امنِ عامہ کی برقراری ہے کیونکہ امن عامہ کی برقراری کے بغیر کوئی تعمیری کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے انہوں نے پولس کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا۔ یہ تو تھا احساس ذمہ داری لوگوں کے تئیں اور اپنے تئیں آخرت میں کامیابی کی کوششوں کا یہ حال تھا کہ رات کو بہت تھوڑی دیر سوتے اور تقریباً پوری رات اپنے رب سے مناجات میں صرف کردیتے۔ اسی طرح ایام ممنوعہ

کے علاوہ دن میں مسلسل روزہ رکھے جس دن آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا اس دن بھی آپ روزہ سے تھے۔

آپ کا عظیم ترین کارنامہ لغتِ قریش کے مطابق قرآن پاک کی تدوین ہے آپ حافظ قرآن تھے اور قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت کیا کرتے تھے۔ جس وقت آپ خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے اس وقت بھی آپ تلاوتِ کلام پاک میں مشغول تھے۔

آپ سے پند ونصائح اور حکمت کے کلمات بھی نقل کئے گئے ہیں آپ فرماتے ہیں:

اللہ کے ساتھ تجارت کرو تو بہت نفع ہوگا۔ بندگی اس کو کہتے ہیں کہ احکامِ الٰہی کی حفاظت کرے جو وعدہ کسی سے کرے اس کو پورا کرے، جو کچھ مل جائے اس پر راضی رہے اور جو نہ ملے اس پر صبر کرے۔ متقی کی علامت یہ ہیکہ سب لوگوں کے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ نجات پائیں گے اور اپنے بارے میں یہ سمجھے کہ وہ ہلاک ہوگیا۔ سب سے زیادہ بردباری یہ ہے کہ کسی کو بڑی عمر ملے اور سفر آخرت کی کچھ تیاری نہ کرے۔ دنیا جس کے لئے قید خانہ ہو قبر اس کے لئے باعث راحت ہوگی۔

عدل وانصاف اور خوف کی یہ حالت تھی کہ ایک بار تنبیہ کرنے کیلئے آپ نے اپنے غلام کی گوشمالی کی۔ اس کے بعد فوراً یہ فرمایا کہ مجھ سے بدلہ لے لو۔ دنیا میں قصاص کا ہوجانا آخرت کے قصاص سے بہتر ہے۔

آپ کی پانچ ہزار تنخواہ مقرر تھی لیکن آپ نے بیت المال سے کبھی بھی تنخواہ نہیں لی۔ بلکہ کوشش یہ کی کہ اپنے ذاتی مال سے لوگوں کی مدد کریں اور ان کی راحت و آرام کا خیال رکھیں۔

زمانہ خلافت کے نصف اخیر میں حالات میں تبدیلی شروع ہوئی جس کی ابتداء

آپ کی مخالفت اوراس کی انتہا آپ کی شہادت پر ہوئی۔ حصول اقتدار اور بقائے اقتدار کے لئے آپ جنگ وجدال اورخوں ریزی کوقطعاً ناپسند کرتے تھے۔ حالات جب نازک تر ہو گئے اور بعض حلقوں سے مشورے بھی آئے کہ آپ ان کا مقابلہ کریں لیکن آپ نے فرمایا کہ میں اپنے گھر سے باہر نکل کر جنگ نہیں کرسکتا اور مجھے قطعاً یہ گوارا نہیں کہ خون بہاؤں۔ آپ اپنے نظریہ پر اخیر تک قائم رہے یہاں تک کہ چند افراد آپ کے مکان میں عقبی حصے کی طرف سے گھسے اور آپ کو شہید کر دیا بروز جمعہ، ذی الحجہ ۳۵ھ میں نوے (۹۰) سال کی عمر میں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور اپنے رب حقیقی سے جاملے۔

حضرت عثمانؓ کی پوری زندگی ہمارے لئے درس عبرت ہے۔ آپ نے اپنی جان دے دی لیکن جنگ وجدال اور فتنہ وفساد کو گوارا نہ کیا۔ اپنی دولت کو صرف اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا بلکہ لوگوں کی نفع رسانی اور ان کے دکھ درد میں اپنی دولت کے ذریعہ حصہ بٹایا اپنے خدام کی راحت کا خاص خیال رکھا۔ اسی طرح عام لوگوں حتیٰ کہ جانوروں کی ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا۔

دور حاضر میں جبکہ انسان خود انسانیت سے عاری ہوتا جارہا ہے اور غمخواری و ہمدردی، ایثار ونفع رسانی یہ سب چیزیں عنقا ہوتی جارہی ہیں اور خودغرضی، نفس پرستی، جاہ طلبی، زرپرستی، بغض وعداوت اور کذب بیانی ودروغ گوئی عام ہوتی جارہی ہے ضرورت ہے کہ ہم انکو اپنی زندگی کا نمونہ بنائیں تاکہ درد سے سسکتی جاں بلب انسانیت کو درماں میسر آئے اور ایک مثالی معاشرہ اور آدرش سماج وجود میں آئے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انسان اطمینان وسکون کی زندگی گذار سکے اور صلاحتیں تخریب پر صرف ہونے کے بجائے تعمیر پر صرف ہوں کہ اسی میں ترقی کا راز پوشیدہ ہے بلکہ یہی ترقی کی شاہ کلید ہے۔

روزہ کی طبّی اہمیت

(تاریخ نشر ۲۲ر جنوری ۱۹۹۶)

اقوام عالم کی تاریخ کے جائزے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر قوم میں روزہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور پایا جاتا رہا ہے جسے دوسری قومیں برت، فاسٹ، یا ان جیسے الفاظ سے تعبیر کرتی ہیں اوراس کائنات کے پیدا کرنے والے نے خود اپنی پاک کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے کہ ''اے مسلمانو! اگر تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں تو اقوام عالم کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تم سے پہلے جو امتیں گزر چکی ہیں ان پر بھی روزے فرض کئے گئے تھے اور مقصد یہ تھا کہ ان کے دل میں تقویٰ ان کی روح میں بالیدگی، نفس میں صبر واستقامت، دل میں خوف خداوندی اور قلب ونظر میں پاکیزگی اور نورانیت پیدا ہو۔

مکّی زندگی کے آخری دور میں نماز فرض کی گئی اور مدنی زندگی کے ابتدائی دور (شعبان ٦ھ) میں رمضان المبارک کے روزے فرض کئے گئے۔ اسلام میں طلوع فجر سے غروب آفتاب تک روزے کی نیت اور ثواب ورضائے الٰہی کے حصول کی امید میں کھانے پینے اور بیوی کے ساتھ صحبت سے رکنے کو روزہ کہتے ہیں۔

رمضان المبارک کے روزہ کی فرضیت کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مرضیات خداوندی کا تابع بنالے، اپنی خواہشات، آرزو، امنگوں اور جذبات وخیالات کے جزائر کو اس کی اطاعت کے بحر ناپیدا کنار میں اس طرح گم کردے کہ اپنی ذاتی وفطری حاجت کی تکمیل میں بھی اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کی نیت ہو۔

گیارہ ماہ تک اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں سے پرہیز کرنے اوراس سے بچنے کی

مشق کرائی اور بندہ اس میں اللہ کی کسوٹی پر پورا اترا۔لیکن امتحان عشق میں اس کسوٹی کو بھی آخری معیار تصور نہیں کیا گیا بلکہ حکم ہوا کہ اگر تم واقعی دعویٰ محبت میں سچے ہو تو حرام چیزوں سے پرہیز کے علاوہ تم کو بعض حلال اشیاء سے بھی پرہیز کرنا ہوگا کیوں کہ حرام اشیاء سے پرہیز کی وجہ طبعی وفطری کراہت بھی ہوسکتی ہے۔صحت وعقل کی حفاظت بھی اس کا سبب ہوسکتی ہے لیکن مخصوص ومتعین اوقات میں پاک وحلال اشیاء سے پرہیز کرنا اور رک جانا اس کا سبب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ صرف جذبۂ اطاعت خداوندی ہی ہوسکتا ہے۔بندہ جب اس امتحان میں معیارِ خداوندی پر پورا اترتا ہے تو مژدہ جاں فزا سنایا جاتا ہے۔مژدہ کے الفاظ ہیں:

انسان کی ہر نیکی دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھائی جاتی ہے لیکن روزہ اس سے مستثنٰی ہے۔بندہ روزہ میرے لئے رکھتا ہے اور اس کا بدلہ میں خود ہوں یا اس کا بدلہ میں خود دونگا وہ میری خاطر اپنی خواہش اور کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔(بخاری ومسلم)۔

دوسرح جگہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

جنت میں ایک دروازہ ہے جس کا نام ریّان ہے اس دروازہ سے قیامت کے دن صرف روزہ دار ہی داخل ہونگے ان کے سوا کوئی اور اس دروازہ سے داخل نہ ہوسکے گا اور جب وہ داخل ہوجائیں گے تو دروازہ بند کردیا جائے گا اور پھر اس دروازہ سے کوئی اور داخل نہ ہوسکے گا۔(بخاری ومسلم)۔

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر ملکوتی صفات پیدا ہوں اور انسان اپنی خواہشات اور عادات کے شکنجے سے آزاد ہوسکے اس کی شہوانی قوت میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس ذریعہ سے وہ سعادت ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کرسکے۔اور حیات سرمدی کے حصول کیلئے اپنے نفس کا تزکیہ کرسکے۔بھوک اور پیاس سے اس کے ہوس کی تیزی

اور شہوت کی حدت میں تخفیف پیدا ہو اور یہ بات ہر وقت اس کے دل میں جاگزین رہے کہ کتنے مسکین نادار، بے کس وبے بس وبے نوا ہیں جو نانِ شبینہ کے محتاج ہیں وہ شیطان کے راستوں کو تنگ کردے اور اعضاء وجوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے جن سے دنیا وآخرت دونوں کا نقصان ہے اس لحاظ سے یہ روزہ تقوی کی لگام مجاہدین کی ڈھال اور متقین کی زرہ ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ رمضان کے دنوں میں حلال غذا کے استعمال میں بھی احتیاط سے کام لیا جائے اور اتنا نہ کھایا جائے کہ اس کے بعد گنجائش باقی نہ رہے اگر روزہ دار افطار کے وقت دن بھر کی تلافی کردے اور جو کچھ دن بھر میں کھانے والا تھا وہ ایک وقت میں ہی کھالے تو شیطان پر غالب آنے اور شہوت کو ختم کرنے میں اس سے کیا مدد مل سکتی ہے؟ مسلمانوں میں یہ ایک عام عادت ہوگئی ہے کہ رمضان کے دنوں میں اتنا عمدہ اور متنوع کھانا کھایا جاتا ہے جو اور دنوں میں نہیں کھایا جاتا حالانکہ روزہ سے مقصود تو خالی پیٹ رہنا ہے اور خواہشات نفس کو دبانا ہے تاکہ تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو۔

انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو اس لئے شریعت نے روزہ کے لئے ایمان اور احتساب کی شرط لگائی ہے۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے ایمان اور ثواب کی نیت سے روزے رکھے تو اس کے گذشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اسی لئے اگر کوئی شخص کسی اور نیت سے روزہ رکھے اور آخرت میں ثواب اور حکم خداوندی کی بجا آوری کا مکمل احساس اس کے دل میں موجود نہ ہو تو ایسا روزہ بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت حاصل نہیں کرتا۔

نبی آخر الزماں ﷺ نے فرمایا کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ انہیں اپنے روزہ سے سوائے بھوک کے اور کچھ نہیں ملتا۔دوسری حدیث میں ہیکہ جس نے جھوٹ بولنا اور

اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

جب روزہ دار کے دل کی گہرائیوں میں ایمان واحتساب کی صورت میں روزہ کا حقیقی مقصد موجود ہوتا ہے تو روزہ کے حقیقی اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور روزہ دار ایک ایسا فرشتہ صفت انسان بن جاتا ہے جو اپنے ہم جنسوں کے لئے اسوہ اور نمونہ بن جاتا ہے اور ایسے لوگوں کے استقبال کی تیاریاں آسمان پر اس طرح ہوتی ہیں کہ جوں ہی رمضان کا مہینہ آتا ہے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین پابہ زنجیر کردیئے جاتے ہیں۔ رحمت الٰہی ہر وقت سایہ فگن رہتی ہے اس کے فضل وکرم کا بحرِ بے کراں موجزن رہتا ہے۔ اطاعت وفرمانبرداری کے موسم بہار سے دل کی کلیاں کھل اٹھتی ہیں اور نوازش خداوندی کی گھٹائیں برق وباراں بن کر کشت طاعت کو لالہ زار اور خرمن معصیت کو خاکستر کردیتی ہیں۔ اب روزہ دار ایسی فضاء اور ماحول میں سانس لیتا ہے جس میں اس کے لئے بھوک اور پیاس کی شدت کو برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے اور ملنے والی نیکیاں اور رضائے خداوندی اس پر مستزاد۔ اسی پر بس نہیں کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھ دی جائیں بلکہ اگر اس نے کسی روزہ دار کو افطار کرادیا تو اس کو روزہ دار کے مثل اجر ملے گا اور اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

جس طرح پورے دن بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنا حکم خداوندی کی تعمیل میں ہے اس طرح غروبِ آفتاب کے بعد فوراً افطار بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں ضروری ہے خواہ زہد وترک دنیا کے جذبات اس وقت کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: اس وقت تک لوگ خیر وفلاح میں رہیں گے جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے اس وقت تک دین کا بول وبالا قائم رہے گا کیوں کہ اہل کتاب اس میں

تاخیر کرتے ہیں۔ (ابوداؤد)۔

اسی طرح حدیث میں سحری کی ترغیب آئی آپ ﷺ نے فرمایا سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری میں برکت ہے اور یہ ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے کیوں کہ اہل کتاب سحری نہیں کھاتے ہیں۔

ماہ رمضان میں ذکر تلاوت ودعا استغفار کی کثرت ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہئے۔ شب قدر، اعتکاف اور صدقہ کی کثرت ایک مسلمان کی اہم علامتیں ہیں۔ جن کے پاس ولحاظ سے قرب خداوندی کی منزلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روزے کے طبی اور جسمانی فوائد بھی ہیں جنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ روزہ سے جسم کی قوتِ حیاتی میں توازن پیدا ہوتا ہے اور جسم میں ایک نئی تازگی اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ امریکی ماہر صحت ڈاکٹر ماک فاڈون لکھتا ہے۔

ہر انسان کو روزے رکھنے چاہئے کیونکہ غذاؤں اور دواؤں کے مسموم اثرات جسم میں جمع ہوکر انسان کو بیمار بنادیتے ہیں جس سے اس کے جسم میں ثقل وگرانی پیدا ہوجاتی ہے اور نشاط وپھرتیلا پن جاتا رہتا ہے۔ جب وہ چند دنوں کے روزے رکھ لیتا ہے تو اس کے جسم سے ثقل وگرانی جاتی رہتی ہے۔ زہریلے اثرات تحلیل ہوجاتے ہیں اور ایسی صفائی، امنگ اور نشاط وقوت کارفرما ہوتی ہے۔ جو اس سے پہلے مفقود تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر پول پراج اپنی کتاب ''روزے کا معجزہ'' میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

تنہا میں ہی روزہ نہیں رکھتا بلکہ ہمارا پورا خاندان روزہ میں شریک ہوتا ہے۔ میں ہر ہفتہ ۲۴ تا ۲۶ گھنٹوں کے لئے کھانے پینے سے مکمل پرہیز کرتا ہوں اس کے علاوہ کم از کم چار

اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

جب روزہ دار کے دل کی گہرائیوں میں ایمان واحتساب کی صورت میں روزہ کا حقیقی مقصد موجود ہوتا ہے تو روزہ کے حقیقی اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور روزہ دار ایک ایسا فرشتہ صفت انسان بن جاتا ہے جو اپنے ہم جنسوں کے لئے اسوہ اور نمونہ بن جاتا ہے اور ایسے لوگوں کے استقبال کی تیاریاں آسمان پر اس طرح ہوتی ہیں کہ جوں ہی رمضان کا مہینہ آتا ہے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین پابہ زنجیر کردیئے جاتے ہیں۔ رحمت الٰہی ہر وقت سایہ فگن رہتی ہے اس کے فضل وکرم کا بحر بے کراں موجزن رہتا ہے۔ اطاعت وفرمانبرداری کے موسم بہار سے دل کی کلیاں کھل اٹھتی ہیں اور نوازش خداوندی کی گھٹائیں برق وباراں بن کر کشت طاعت کو لالہ زار اور خرمن معصیت کو خاکستر کردیتی ہیں۔ اب روزہ دار ایسی فضاء اور ماحول میں سانس لیتا ہے جس میں اس کے لئے بھوک اور پیاس کی شدت کو برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے اور ملنے والی نیکیاں اور رضائے خداوندی اس پر مستزاد۔ اسی پر بس نہیں کہ روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھ دی جائیں بلکہ اگر اس نے کسی روزہ دار کو افطار کرادیا تو اس کو روزہ دار کے مثل اجر ملے گا اور اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

جس طرح پورے دن بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنا حکم خداوندی کی تعمیل میں ہے اس طرح غروبِ آفتاب کے بعد فوراً افطار بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں ضروری ہے خواہ زہد وترک دنیا کے جذبات اس وقت کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا: اس وقت تک لوگ خیر وفلاح میں رہیں گے جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے اس وقت تک دین کا بول وبالا قائم رہے گا کیوں کہ اہل کتاب اس میں

تاخیر کرتے ہیں۔ (ابوداؤد)۔

اسی طرح حدیث میں سحری کی ترغیب آئی آپ ﷺ نے فرمایا سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری میں برکت ہے اور یہ ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان فرق کرنے والی چیز ہے کیوں کہ اہل کتاب سحری نہیں کھاتے ہیں۔

ماہ رمضان میں ذکر تلاوت و دعا استغفار کی کثرت ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہئے۔ شب قدر، اعتکاف اور صدقہ کی کثرت ایک مسلمان کی اہم علامتیں ہیں۔ جن کے پاس ولحاظ سے قرب خداوندی کی منزلیں آسان ہوجاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روزے کے طبی اور جسمانی فوائد بھی ہیں جنہیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ روزہ سے جسم کی قوتِ حیاتی میں توازن پیدا ہوتا ہے اور جسم میں ایک نئی تازگی اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ امریکی ماہر صحت ڈاکٹر ماک فاڈون لکھتا ہے۔

ہر انسان کو روزے رکھنے چاہئے کیونکہ غذاؤں اور دواؤں کے مسموم اثرات جسم میں جمع ہوکر انسان کو بیمار بنادیتے ہیں جس سے اس کے جسم میں ثقل وگرانی پیدا ہوجاتی ہے اور نشاط وپھرتیلاپن جاتا رہتا ہے۔ جب وہ چند دنوں کے روزے رکھ لیتا ہے تو اس کے جسم سے ثقل وگرانی جاتی رہتی ہے۔ زہریلے اثرات تحلیل ہوجاتے ہیں اور ایسی صفائی، امنگ اور نشاط وقوت کارفرما ہوتی ہے۔ جو اس سے پہلے مفقود تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر پول پراج اپنی کتاب ''روزے کا معجزہ'' میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

تنہا میں ہی روزہ نہیں رکھتا بلکہ ہمارا پورا خاندان روزہ میں شریک ہوتا ہے۔ میں ہر ہفتہ ۲۴ تا ۲۶ گھنٹوں کے لئے کھانے پینے سے مکمل پرہیز کرتا ہوں اس کے علاوہ کم از کم چار

روزے سال بیں رکھتا ہوں۔ میری عمر پچاسی سال ہوا چاہتی ہے لیکن کبھی بھی میں نے اپنے اس معمول کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اس پابندی نے میرے اندر زندگی کی روح بھر دی ہے۔ میں روزے سے ہوتا ہوں تو اپنی نگاہ میں تیزی، زندگی میں جوش وخروش اور ذہن ودماغ میں توانائی وبیداری محسوس کرتا ہوں۔

غرض روزے کے روحانی فوائد بھی ہیں اور طبی وجسمانی بھی، اس لئے ضروری ہیکہ روزہ رکھ کر ہم دونوں فوائد حاصل کریں۔ اگر اس مہینہ میں کسی کو اعمال صالحہ کی توفیق مل گئی تو پورے سال یہ توفیق شامل حال رہے گی اور اگر یہ مہینہ بے دلی فکر وتردد اور انتشار کے ساتھ گذرا تو پورا سال اسی حال میں گذرنے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اس ماہ سے بھرپور استفادہ کی کوشش کریں۔

مقدس کتابوں کی روشنی میں : پڑوسیوں کے حقوق

(تاریخ نشر ۵/اپریل ۱۹۹۶)

دنیا کے تمام مذاہب نے انسانی بھائی چارہ اور الفت ومحبت کی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے کیونکہ پوری نسل انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے اور انسان ہونے کے اعتبار سے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سب برابر ہیں۔ زبان رنگ، نسل، اور جغرافیائی حدود کے اختلاف کی بنیاد پر دو انسانوں میں فرق کرنا کسی بھی آسمانی مذہب کی تعلیمات کی روشنی میں روا نہیں۔ ایسا شخص ناپسندیدہ ہے جو دو پیاسے انسانوں میں امتیاز برتے، اپنے رشتہ دار کو پانی پلائے، اور دوسرے شخص کو صرف اس لئے پانی سے محروم رکھے کہ وہ اس کا رشتہ دار یا ہم عقیدہ نہیں ہے۔

جب قیامت ہوگی تو اس کائنات کا پیدا کرنے والا انسانوں کو مخاطب کر کے فرمائے گا آدم کے بیٹے میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی وہ کہے گا اے میرے رب میں آپ کی عیادت کیسے کرتا آپ تو پوری کائنات کے رب ہیں۔ اللہ تعالی فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو تو نے اس کی عیادت نہیں کی کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا وہ کہے گا آپ میرے پیدا کرنے والے ہیں آپ کو کھانا کیسے کھلاتا؟ اللہ تعالی فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تو تو نے اسے کھانا نہیں دیا اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا وہ کہے گا آپ تو پوری کائنات کے پالنے والے ہیں میں آپ کو پانی کیسے

پلاتا تو دنیا کا پیدا کرنے والا فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو اگر اسے پانی پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔

افراد سے سماج اور سوسائٹی تشکیل پاتی ہے، افراد کے فرائض اور حقوق اور سماج کے حقوق وفرائض میں اگر تال میل نہ ہو تو سوسائٹی کی صحت مند نشونما نہیں ہوسکتی ایک انسان جب تمدنی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو لوگوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے جہاں وہ سکونت اختیار کرتا ہے اس کے قرب وجوار میں جو لوگ ہوتے ہیں ان کو ہم پڑوسی کہتے ہیں۔اگر بالکل مقام سکونت قریب ہے تو وہ قریبی پڑوسی کہلاتا ہے اور اگر کچھ دور ہے تو دور کا پڑوسی کہلائے گا۔ان دونوں قسموں کے پڑوسیوں کی سکونت چونکہ مستقل ہوتی ہے اس لئے یہ مستقل پڑوسی ہوتے ہیں۔

تمدنی زندگی کا دائرہ جب اور وسیع ہوتا ہے تو بس اسٹینڈ پر، پلیٹ فارم پر، ایئر پورٹ پر، جہاز میں، بس میں، ٹرینوں میں، آفس میں، ہماری ایک دوسرے سے آشنائی ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ان کا ہمارا ساتھ ہوتا ہے وہ بھی ہمارے پڑوسی ہیں لیکن عارضی اور غیر مستقل۔ان تینوں قسموں کے پڑوسیوں کے ہم پر حقوق عائد ہوتے ہیں جن کی ہمیں رعایت کرنی چاہئے۔

پڑوسی کا مکان دور ہو یا قریب، رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار، مسلمان ہو یا غیر مسلم، مستقل ہو یا عارضی ان تمام کے ساتھ حسن سلوک انسان کا مذہبی، اخلاقی اور سماجی فریضہ ہے۔

انجیل میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عیسی علیہ السلام کے پاس آکر عرض کیا اے استاد میں کون سی نیکی کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں۔انہوں نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات پوچھتا ہے نیکی تو ایک ہی ہے لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو

حکموں پر عمل کر چوری نہ کر، جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے باپ کی اور ماں کی عزت کر اور اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ۔(انجیل متیٰ ب ۱۹ آیت ۲۰۔۱۶)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم یہ تھی کہ پڑوسیوں سے اسی طرح محبت کرنی چاہئے جس طرح انسان اپنی ذات سے محبت رکھتا ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کی شرارتوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو (مسلم) اور دوسری جگہ فرمایا وہ مسلمان نہیں وہ مسلمان نہیں وہ مسلمان نہیں۔عرض کیا گیا کون؟ فرمایا جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔(بخاری ومسلم)۔

پڑوسی ہر قسم کے ہوتے ہیں ان میں کمزور بھی ہوتے ہیں اور مجبور، بھی بے کس بھی اور یتیم بھی، تنگ دست اور مفلوک الحال بھی ان میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا بھوکوں کو کھانا کھلانا، مصیبت میں گرفتار پڑوسیوں کے دکھ کو دور کرنا، یتیم بچوں اور بچیوں کے سر پر دست شفقت پھیرنا، دوسروں کے لئے جینا اور دوسروں کی نفع رسانی میں اپنی توانائیاں صرف کرنا، اس سلسلہ کے بے شمار واقعات ہیں کہ خود بھوکے رہے اور پڑوسیوں کو کھانا کھلایا، پیارے نبی ﷺ نے فرمایا وہ شخص مومن نہیں جو خود پیٹ بھر لے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے (بیہقی، مسند احمد)۔ یہاں تک فرمایا گیا کہ جب تم کوئی سالن پکاؤ تو شوربہ زیادہ کر دیا کرو اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھو۔(مسلم)۔

پڑوسی کی خبر گیری، ان کے حقوق کی رعایت، جب وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت رنج وغم میں ان کی مزاج پرسی اور دکھ درد میں ان کا ہاتھ بٹانا قابل تحسین عمل ہے، ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کے یہاں وہ لوگ بہتر ہیں جو اپنے ساتھیوں کے لئے بہتر ہیں اور اللہ کے یہاں وہ پڑوسی بہتر ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہے۔(ترمذی)۔

پڑوسی کا یہ حق ہے کہ اس کا پڑوسی اس کی عیب جوئی نہ کرے اس کی ٹوہ میں نہ لگا رہے ان کے عیوب کا پردہ چاک کرنے کے بجائے ان کے عیوب کی پردہ پوشی کرے، ذاتی اغراض اور نجی مفادات سے بالاتر ہو کر ہمیں اپنے پڑوسیوں کے حقوق کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔

پڑوسی سے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ملاقات کا اہتمام ضروری ہے اس لئے کہ ملاقات اور مزاج پرسی سے محبت پائیدار اور وسیع ہوتی ہے اور اس کے اثرات دور رس نتائج پیدا کرتے ہیں۔ الفت ومحبت کی دنیا پر اثر انداز ہونے والی چیزوں میں ہدیہ اور تحفہ بھی ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ تحفہ کے لین دین سے عداوت دور ہوتی ہے اور محبت اس کی جگہ لیتی ہے۔ تحفہ اور ہدیہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ہمارے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ کوئی پڑوسن کسی پڑوسن کے تحفہ کو ہرگز حقیر نہ سمجھے چاہے وہ بکری کی ایک کھر ہی کیوں نہ ہو۔ (بخاری۔ مسلم)۔

دو پڑوسیوں میں آپ کا وہ پڑوسی آپ کی محبت وہمدردی کا زیادہ مستحق ہے جس کا دروازہ آپ کے دروازہ سے زیادہ قریب ہو۔ ہمارے نبی سے پوچھا گیا کہ ہمارے دو پڑوسی ہیں کس کو تحفہ بھیجوں آپ ﷺ نے فرمایا جس کا دروازہ تم سے قریب ہو۔ (بخاری)۔

اسلام نے حسن سلوک کی تعلیم دی ہے تو اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ پڑوسی کے ساتھ برائی سے پیش نہ آئیں بلکہ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کا خیر خواہ ہو۔ آڑے وقت میں کام آئے۔ دکھ درد میں برابر کا شریک ہو۔ ایک دوسرے کی مالی و اخلاقی اعانت کرے ایک دوسرے کے اہل وعیال کا خیال رکھے۔ کوئی ایسا کام نہ ہو جس سے پڑوسی کی دل آزاری ہو۔ اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو معاف کردیں کیونکہ معاف کردینے سے محبت بڑھتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آواز اس قدر بلند نہ کریں جس سے پڑوسی کی دل

آزاری ہو اور اس کے سکون میں خلل واقع ہو۔ ایک پڑوسی بعض دفعہ ان عزیزوں اور رشتہ داروں سے زیادہ دکھ درد اور مختلف مواقع پر ہمارا ہاتھ بٹاتا ہے جو دور ہیں اور ہر وقت ان کو اطلاع دینا ممکن نہیں ہوتا اس لئے پڑوسی کو نظر انداز کرنا اور ان کے حالات سے بے خبر رہنا ایک ایسا عمل ہے جو اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہ میں ناقابل معافی جرم ہے۔

پڑوسیوں کے حقوق اس قدر زیادہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل امین مجھے پڑوسی کی رعایت اور امداد کی تاکید کرتے رہے یہاں کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی رشتہ داروں کی طرح وراثت میں شریک کردیا جائے گا۔ (بخاری ومسلم)۔

وہ پڑوسی جن سے ہمارا تھوڑی دیر کے لئے ساتھ ہوتا ہے اسٹیشن پر، بس اسٹینڈ پر، ایئر پورٹ پر، آفس میں، درسگاہ میں، ان کے ساتھ بھی حسن سلوک ضروری ہے ان تمام جگہوں پر ایسی گفتگو نہ کریں جس سے آپ کے اس لمحاتی یا عارضی پڑوسی کی دل آزاری ہو۔ آپ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے اس کو تکلیف پہنچے مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں۔ پان کھا کر پیک اس طرح نہ ڈالیں جس سے آپ کے پڑوسی کا لباس اور اسکے نتیجہ میں اس کا دل داغدار ہو۔ ان مواقع پر اور سفر کے دوران بات چیت اور ریڈیو کا استعمال اس طرح نہ کریں کہ اس پڑوسی کو تکلیف پہنچے۔

تمام مقدس کتابوں میں پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کی تعلیم دی گئی ہے اس لئے چاہئے کہ آج جب کہ اس اہم گوشے کی جانب سے غفلت برتی جارہی ہے ہم اٹھیں اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ایسی فضاء قائم کریں جس سے پوری سوسائٹی میں الفت ومحبت اور ایثار وقربانی کا جذبہ پروان چڑھے اور ہماری سوسائٹی ایک ایسی مثالی سوسائٹی بن کر ابھرے جو دوسروں کے لئے اسوہ اور نمونہ ہو۔

اردو میں سفر نامہ کی روایت

(تاریخ نشر ۲۶/اگست ۱۹۹۶)

سفر نامہ روداد سفر کا نام ہے جو مثبت یا منفی جذبات وخیالات اور اثرات سے مرکب ہوتا ہے۔اس طرح سفر نامہ وہ طرزِ تحریر اور اسلوب بیان ہے جس میں سیاح اپنے داخلی احساسات کو خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، قلبی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے جس میں قلم کی جولانی بھی ہوتی ہے اور فکر وخیال کی طغیانی بھی اور جولانی وطغیانی کی امتزاجی کیفیت اتنی وسیع عمیق اور دلآویز ہوتی ہے کہ وہ قاری یا سامع پر اثر انداز ہوتی ہے اور قلب ونظر اور فکر وخیال کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ یہ سفر نامے گھر سے شروع ہوتے ہیں اور غریب خانہ کی دہلیز پر اختتام پذیر ہو جاتے ہیں کبھی اس میں جان لیوا طوالت ہوتی ہے تو کبھی جان گسل اختصار۔

آج سفر نامہ ہمہ جہت اور ہمہ مقصد بن گیا ہے۔ سفر کی حیثیت تجارتی ہو یا مذہبی، علمی ہو یا تفریحی، بہر حال اس کا مقصد ذاتی معلومات کو عام کرنا اور اپنے تجربات اور مشاہدات کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ جس میں بعض دفعہ قارئین وہ خصوصیات ڈھونڈ نکالتے ہیں جو شعوری طور پر لکھنے والے کے ذہن میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں۔ یہ ضروری نہیں کہ مسافر ادیب ہو تو اچھا سفر نامہ لکھے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ غیر ادیب سے اچھا سفر نامہ معرض وجود میں نہ آئے۔

منثور اردو کے سفر کی داستان کا سراملا وجہی کی سب رس، سید اشرف جہانگیر سمنانی، شیخ عین الدین گنج، اور شاہ قلندر کے رسائل اور فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ ۱۸۰۰) سے ملتا ہے،

اس کالج سے اردو نثر میں آسان نثر نگاری کا آغاز ہوا۔ ملک کے نامور ادباء کے ذریعہ آسان اور سلیس اردو زبان میں کتابیں ترجمہ کرائی گئیں۔ ان میں باغ و بہار کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ باغ و بہار قصہ چہار درویش کا آسان اردو ترجمہ ہے۔

میر امن نے نہایت سلیس اور آسان زبان میں یہ داستان قلم بند کی ہے۔ میر امن کے بعد سید حیدر بخش حیدری کا نام آتا ہے۔ انہوں نے قصہ مہر و ماہ اور قصہ لیلیٰ ومجنوں کے ترجمہ کے ساتھ قصہ حاتم طائی کا بھی ترجمہ کیا اور اُسے آرائش محفل کے نام سے مرتب کیا۔ اسی زمانے میں مرزا رجب علی بیگ نے اپنی مشہور کتاب فسانہ عجائب مرتب کی۔ اس طرح ہندوستان میں اردو فارسی کی جگہ لینے لگی اور ۱۸۳۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان قرار دیا۔ مجموعی طور پر اس کے اثرات ملک کے طول وعرض میں پڑے اور اردو زبان میں لکھنے کا رجحان فروغ پانے لگا۔

اردو میں سفر ناموں کی تاریخ اردو نثر کی تاریخ کے مقابلہ میں جدید تر ہے۔ اردو میں ابھی تک جو سفر نامے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سفر نامہ ''مثنوی نادر'' کو اولیت حاصل ہے اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے اور اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ منظوم سفر نامہ ہے۔ عام طور پر جتنے سفر نامے لکھے گئے ہیں وہ نثر میں ہیں لیکن یہ سفر نامہ مثنوی کی شکل میں لکھا گیا ہے اور مثنوی نادر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۸۲۳ء کا ہے۔ یہ نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ کا سفر نامہ ہے جسے نادر نے منظوم شکل میں پیش کیا ہے۔

درحقیقت نواب اعظم جاہ نے مدراس سے ناگور شریف کا سفر کیا تھا یہ سفر درگاہ قادر ولی کی زیارت کے لئے کیا گیا تھا۔ ناگور شریف میں عبدالحمید عبدالقادر گنج سوائی المتوفی ۹۷۲ھ کی درگاہ ہے۔ مثنوی نادر کی زبان آسان اور سلیس ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

میں یوں جور گردوں سے ہوں تنگ بس
کہ نالاں ہیں جس سے میرے ہم نفس
عجب کچھ ہے دور فلک بد دماغ
ہما استخواں کھاوے انجیر زاغ
زبس جو زمانے کا الٹا ہے کام
کہ مینڈک کو ہونے لگی ہے زکام

سفرنامہ نادر کے بعد دوسرا نام ''عجائبات فرنگ'' کا آتا ہے۔ یہ یوسف خاں کمبل پوش حیدرآبادی کا سفرنامہ ہے انہوں نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا تفریحی سفر کیا تھا۔ اگر سفرنامہ نادر اردو کا پہلا منظوم سفرنامہ ہے تو ''عجائبات فرنگ'' اردو کا پہلا منثور سفرنامہ ہے۔

سفرنامہ عجائبات فرنگ یورپ کا قدیم سفرنامہ ہے اسی لئے اس سفرنامے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنے سفر کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے بعد مختلف سفرنامے وجود میں آئے۔ ان میں مسافران لندن'' از سرسید احمد خان'' سیر ایران'' از محمد حسین آزاد'' سفرنامہ مصر و روم و شام'' از علامہ شبلی اور دہلی اور اس کے اطراف از مولانا عبدالحی لکھنوی قابل ذکر ہیں۔

اردو میں سفرناموں کو اگر موضوع کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہیں تو درج ذیل خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) مذہبی سفرنامے: یعنی وہ روداد سفر جو مقامات مقدسہ اور حج و زیارت سے متعلق ہیں۔

(۲) مقامی سفرنامے: یعنی وہ اسفار جو اندرون ملک پیش آئے اور ان کی روداد

قلمبند کی گئی۔

(۳) مشرقی سفرنامے: یعنی وہ اسفار جن میں ایران و عراق، مصر و شام، پاکستان، افغانستان، فلسطین و اردن کے مشاہداتِ سفر قلمبند کئے گئے۔

(۴) مغربی سفرنامے: یعنی وہ سفرنامے جن میں امریکہ، یورپ اور افریقہ وغیرہ کے مشاہداتِ سفر کو کاغذی پیرہن عطا کیا گیا ہے۔

سفرنامے اپنے عہد کی تہذیبی تاریخ ہوتے ہیں جو واقعات بعض دفعہ بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے وہ واقعات مختلف سفرناموں میں ہمیں آسانی کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ سیاح اپنے زمانہ کے حالات و واقعات کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کرتا ہے۔ شادی بیاہ کے طریقے اور مختلف رسم و رواج کو سفرناموں میں جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے وہ عام تاریخی کتابوں میں نہیں ملتے۔ سفرنامہ کی تاریخی اور سماجی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالباً کسی ملک کے حالات جاننے کیلئے تاریخ سے زیادہ سفرنامے مفید ثابت ہوتے ہیں سیاحوں کی ڈائریاں نئے ملک اور علاقوں کے جغرافیائی حالات کو بھی پیش کرتی ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سفرنامے ہمارے لئے صرف تاریخی سماجی اور معاشرتی معلومات ہی فراہم نہیں کرتے بلکہ جغرافیائی معلومات کا بھی ذریعہ ہیں۔

سفرنامے نہ صرف تاریخی، سماجی اور جغرافیائی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ وہ بڑے بڑے عالم و فاضل، رشی و صوفی، حاکم و شاعر، تاجر و کاشت کار، صنعت و حرفت اور علم و فن کے بارے میں معلومات بہم پہونچاتے ہیں۔ سفرنامہ اور تاریخ میں فرق یہ ہے کہ تاریخ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ مواد سے ترتیب دی جاتی ہے جب کہ سفرنامہ سیاحت کے حالات و واقعات، مشاہدات و تجربات کو پیش کرتا ہے۔ سفرنامہ میں سیاح تاریخ کے ساتھ تاریخی واقعہ

کے پس منظر کو بھی پیش کرتا ہے۔ جغرافیائی حالات بھی بیان کرتا ہے وہاں کی آب وہوا، پہاڑ، جنگل، قدرتی مناظر، پیداوار، اقتصادی حالات اور تعلیمی احوال کا بھی ذکر کرتا ہے۔

سفرنامے اخلاقی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک سیاح جب ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرتا ہے تو اسکو وہاں کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہاں کے لوگوں کے عادات واطوار سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور وہاں کے باشندوں کے بارے میں رائے زنی کرتا ہے ان کی مہمان نوازی، فیاضی، فراخدلی، وسیع المشربی اور وسیع القلبی کے واقعات کو اپنے سفرنامہ میں جگہ دیتا ہے۔

سفرناموں سے طرز تعلیم، مدت تعلیم اور نصاب تعلیم پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اوراس کے اطراف کا سفر کیا وہ اپنے سفرنامہ میں دہلی کے مدرسہ طبیہ (میڈیکل کالج) کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”مدرسہ طبیہ (میڈیکل کالج) میں فن تشریح (سرجری) ڈاکٹری کے قاعدہ کے موافق خوب ہوتا ہے ایک ڈاکٹر اسی غرض سے مدرسہ میں مقرر ہے۔ جماعت اول کے طلباء مطب میں شریک ہوتے ہیں مہینہ میں دو ہفتے حکیم عبدالمجید خان کے پاس مطب میں نسخہ نویسی کرتے ہیں اور دو ہفتہ سول سرجن کے یہاں شفاء خانہ میں طریق علاج دیکھتے ہیں۔ جماعت اول کے طلبہ امتحان کے بعد بھی ایک سال تک مطب کرتے ہیں اس وقت ان کو سند دی جاتی ہے جماعت کی خواندگی ایک سال میں ختم ہوتی ہے۔ چار جماعتیں ہیں خواندگی ہر جماعت کی علیحدہ ہے۔ دواسازی میں بھی امتحان ہوتا ہے۔ طرز تعلیم اس مدرسہ کا بہت اچھا ہے مگر طرزِ مطب جہاں تک خیال کرتا ہوں ناکافی ہے کیوں کہ بیشتر مرکبات کا استعمال ہوتا ہے علاج الامراض کے نسخے مطب میں معمول بہا ہیں بطور خود طلبہ ان کو یاد کر لیتے ہیں۔“

سفرناموں کے مختصر تاریخی جائزے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اردو میں جو سفر نامے لکھے گئے ہیں وہ مواد اور معلومات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سفرنامے صرف سفرنامے لکھنے کے شوق میں نہیں لکھے گئے بلکہ ان کی علمی تاریخی تہذیبی معاشرتی اور ادبی اہمیت ہے۔ ان سفرناموں سے ہمیں مختلف ادوار کے محاورات کا بھی علم ہوتا ہے۔ اسی طرح طرز املاء سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

جہاں تک اردو کے سفرناموں کی زبان کا تعلق ہے اس میں تصنع اور مشکل پسندی کے بجائے ایسی زبان استعمال کی جاتی رہی ہے جو ہر ایک کیلئے قابل فہم ہو اس سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ اردو نثر کو عوام سے قریب کرنے میں سفرناموں نے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

سفرنامہ چونکہ ایک قسم کی وقائع نگاری ہے اس لئے سیاح کا یہ اخلاقی فریضہ ہوتا ہیکہ وہ اپنے سفر کی روداد کی ترتیب میں صحبت حقیقت سے کنارہ کشی اختیار نہ کرے بلکہ اپنی معلومات و تجربات کو قاری کے سامنے پیش کرے یہ کہتے ہوئے کہ ۔

سپردم بہ تو مایہ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

زبان کی دلکشی، پیرایہ بیان کی دلآویزی، مشاہدے کی گیرائی و گہرائی اور حالات و واقعات کی ذاتی حقیقی اور لطیف مرقع کشی سفرنامہ کو ایسے دلربا پیکر میں ڈھال دیتی ہے جو ہر زاویہ سے حسن کا مرقع اور رعنائی کا پیکر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور جرس غنچہ کی صدا پہ قافلہ نو بہار کی تعاقب کرنے والی نسیم اس امید پر بادیہ پیمائی کرتی ہے کہ کبھی تو اس کی مہک مشام جہاں کو معطر کرے گی۔ ان خصوصیات کے حامل سفرنامے کسی بھی علاقے، ملک کے سیاسی، سماجی

تہذیبی اور علمی وادبی حالات کا آئینہ دار ہوتے ہیں۔

سفر ناموں میں حقیقت کا تصور تاریخی حقیقتوں سے مختلف ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح شعری حقیقت اور تاریخی حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شاعر کسی واقعہ کو بعینہ بیان نہیں کرتا وہ اس کے تاثر اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کو جذبات واحساسات میں ضم کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ کبھی وہ کسی واقعہ کو بیان کرنے کے لئے صرف اشاروں اور کنایوں کی زبان استعمال کرتا ہے لیکن مورخ کے یہاں جذبات واحساسات یا اشاروں یا کنایوں کی گنجائش نہیں ہوتی وہ تاریخ سنہ اور دن کے ساتھ واقعات کی کھتونی تیار کرتا ہے جب کہ شعری حقیقت دن، وقت تاریخ اور سنہ کی پابند نہیں ہوتی ہے۔

پچھلے دوسو سال کی مدت میں اردو میں جو سفر نامے لکھے گئے ہیں ان کی ایک لمبی فہرست ہے جن کے بیان کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ گنجائش لیکن یہ بات بیانگ دہل کہی جا سکتی ہے کہ سفر نامے اردو زبان وادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں اور اردو نثر کے ارتقاء میں ان کا بہت بڑا رول ہے۔ ان میں تنوع بھی ہے اور نقطہ نظر کی رنگارنگی بھی زبان وبیان کی شگفتگی بھی ہے اور افکار وخیال کی گنگا جمنا بھی۔

سفر نامے کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ اس میں کسی آدمی کے سفر یا کسی شہر یا ملک کی تاریخی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے بلکہ ان کی تاریخی، سماجی، معاشرتی، علمی ادبی اور تہذیبی حیثیت ہے بلکہ سفر نامے اپنے عہد کی تاریخی اور سماجی دستاویز اور رنگارنگ معلومات کا مرقع ہیں۔

اے فرش نشیں عرش تیری مسند ہے

(تاریخ نشر ۸؍دسمبر ۱۹۹۶)

ایک شخص عالم بے خودی میں مئے توحید سے سرشار دیوانہ وار صدا لگا رہا ہے۔ کامیابی کی صدا، کامرانی کی صدا، آو میری اس آواز پر لبیک کہو اور فلاح وشادمانی کے ہفت اقلیم کی شاہ کلید کے مالک بن جاؤ لیکن اہل مکہ کے قلوب مسخ ہو چکے تھے، تیرگی ان کی آنکھوں کا سرمہ بن چکی تھی اور وہ صدائے حق پر گوش بر آواز ہونے کے بجائے دیدہ ودانستہ گراں گوشی کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اب دار ارقم کے مکینوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کل حمزہؓ اور آج عمرؓ حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں۔ یہ تبدیلی مکہ میں کسی بڑے انقلاب کا پیش خیمہ تھی اس لئے سرداران قریش گھبرا اٹھے اور حق کا یہ سیلاب جو امنڈتا جا رہا تھا، اس سیلاب بلاخیز کے سامنے بند باندھنے کیلئے مشرکین مکہ نے بیانگ دہل یہ اعلان کیا کہ صدائے حق کو کچلنے اور دین کی حفاظت کی صرف ایک ہی سبیل ہے کہ بنی ہاشم کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے یہاں تک کہ بنی ہاشم، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے سپرد کر دیں۔ یہ معاشی، سماجی اور معاشرتی بائیکاٹ مسلسل تین سال تک جاری رہا لیکن قربان جائیے ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر، اس ذات کے پائے استقامت میں ذرہ برابر بھی لرزش پیدا نہ ہوئی۔ صبر وعزیمت واستقامت کا یہ پہاڑ جادۂ حق و صداقت پر قائم رہا۔ حالانکہ ان تین برسوں میں جن صبر آزما دردانگیز اور ہمت شکن حالات سے آپ گزرے ان کے سننے سے پتھروں کے دل بھی پگھلنے لگیں۔ معصوم بچے جب بھوک کی

شدت سے بلکتے تو سرداران قریش خوشی سے جھوم اٹھتے۔

پیکر صدق وصفا کو اس تین سالہ بائیکاٹ سے نجات ملی تو پے در پے دو جانکاہ حادثات پیش آئے۔ حضرت ابو طالب کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنے رب حقیقی سے جاملیں ان دونوں حضرات کے اٹھ جانے سے قریشیوں کے دریائے نفرت وعداوت کی طغیانی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ہر لمحہ ایک نئی آزمائش، آزمائش تو شخصیت کو اور نکھارتی ہے اور انبیاء کرام آزمائشوں سے نہیں گھبراتے۔ لیکن چوں کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین میں آپ ﷺ کی دعوت حق صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی تھی اس لئے آپ ﷺ نے اس امید میں کہ شاید اہل طائف اس نسخہ خداوندی سے اپنے قلوب کی اصلاح کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ طائف کا سفر کیا لیکن طائف کا سرسبز علاقہ دعوت حق کے لئے بنجر ثابت ہوا۔ اہل طائف نے اسی پر بس نہیں کیا کہ آپ کی دعوت ٹھکرا دیتے بلکہ اوباشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا کہ وہ آپ پر سنگباری کریں۔ جب حضور اکرم ﷺ نڈھال ہو کر بیٹھ جاتے تو وہ آپ کو اٹھا دیتے اور پھر سنگباری شروع ہو جاتی۔ چشم فلک نے شاید اس سے اندوہناک منظر نہ دیکھا ہوگا۔ اس موقع پر آپ نے ایک دلسوز اور دلگداز دعا مانگی جن کے الفاظ یہ ہیں:

”اے اللہ اپنی بے کسی، بے بسی، بے سروسامانی اور کسمپرسی کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ اے دکھیاروں اور بے نواؤں کے سہارے تو مجھے کس کے رحم وکرم پر چھوڑ رہا ہے، کیا اس حریف کے جو مجھ سے سنگدلانہ برتاؤ کرتا ہے، یا ایسے دشمن کے جس کو آپ نے میرے معاملہ کا مختار کل بنا دیا ہے اگر تیری نگہہ التفات میری طرف متوجہ ہے تو مجھے ان آزمائشوں کی کچھ پروا نہیں لیکن بہر حال آفت کے مقابلے میں تیری جانب سے عافیت کا شامیانہ ہی میرے لئے موزوں ہے۔ تیرے ہی رخ زیبائے نور کی پناہ طلب کرتا ہوں جس سے تاریکیاں چھٹ جاتی

ہیں اور دنیا و آخرت کے معاملات چشم زدن میں حل ہو جاتے ہیں تیرے ہی در پر جبہہ سا ہوں جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ تیری ہی ذات عالی ہے“۔

اب سرزمین بطحا کے رب نے چاہا کہ طائف کے دکھیارے کو مژدہ جانفزا سنائے۔ یہ سنائے کہ اب دور آزمائش ختم ہوا اور یہ بتائے کہ اے میرے محبوب نگہ التفات کا گلہ نہ کر، اگر تو التفات کے قابل نہیں تو بھلا کون التفات کے قابل ہوگا۔ مکہ اور طائف کی سرزمین اگر تنگ دامانی کا گلہ کر رہی ہے تو تجھے ارض شام کی وسعت ناپیدا کنار کی سیر کراؤں گا اور اگر فرش تیرے وجود کے درپے ہے تو عرش تیری مسند بنے گا۔ زندگی کی چالیسویں بہار میں آپ ﷺ نبوت سے سرفراز ہوئے اس کے بعد زندگی کی دس بہاریں اس حال میں گذریں کہ خزاں رسیدہ چمن کو بھی اس بہار پر ترس آئے، اب خزاں رخصت ہوئی اور بہار نے اپنی فتنہ سامانیوں کے ساتھ خزاں کو الوداع کہا اور معراج اس بہار کی تمہید بنی اب شب بہار آئی اور شب بہار میں ساعت وہ ہمایوں آئی جو دیوان قضا میں طائف کے دکھیارے کی سیر ملکوت کے لئے مقرر تھی اور جس میں پیش گاہ ربانی کے دیوان خاص سے حکم خاص کا اجراء اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا۔ رضوان جنت کو حکم ہوا کہ آج مہمان سرائے غیب کو نئے ساز و برگ سے آراستہ کیا جائے۔ شاہد عالم آج مہمان بن کر آئے گا۔ روح الامین کو فرمان پہنچا کہ وہ سواری جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام ہے اور جو خطہ لاہوت کے مسافروں کے لئے مخصوص ہے حرم ابراہیم میں حاضر ہو۔ کارکنان عناصر کو حکم ہوا کہ مملکت آب و خاک کے تمام احکام وقوانین تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دیئے جائیں اور زمان و مکان، سفر و اقامت، روایت وسماعت اور تخاطب وکلام کی تمام طبعی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔

۲۷ رجب اور دوشنبہ کا دن تھا اور بعثت کا دسواں سال۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم

حطیم میں محو استراحت تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور سینہ مبارک کو چاک کر کے قلب اطہر کو آب زم زم سے دھو کر سینہ مبارک کو ایمان و حکمت کے خزانہ سے بھر دیا اس کے بعد سفید رنگ کے تیز رفتار براق نامی جانور پر سوار ہو کر آپ ﷺ بیت المقدس تشریف لائے آپ نے مسجد اقصیٰ کے اندر دو رکعت نماز ادا کی یہاں سے نکلے تو حضرت جبرئیل نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپ ﷺ کے سامنے پیش کئے آپ نے دودھ کا پیالہ لیا اور نوش فرمایا۔

زمینی سفر کے بعد فضائی سفر کی ابتداء ہوئی پہلے آسمان پر آپ ﷺ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور انہوں نے نبی آخر الزماں کا استقبال کیا۔ دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ سے، تیسرے پر حضرت یوسفؑ سے، چوتھے پر حضرت ادریسؑ، پانچویں پر حضرت ہارونؑ، چھٹے پر حضرت موسیٰؑ اور ساتویں پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوگئی۔ تمام انبیائے کرام نے عالم لاہوت کے اس نو وارد مہمان کو ہدیہ تبریک پیش کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو جنت کی سیر کرائی گئی اور آگے بڑھے اور اس مقام تک پہنچے جہاں قلم قدرت کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی اور آگے بڑھے اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور آگے بڑھے اور خلوت گاہ راز میں احد سے احمد و محمود کو ناز و نیاز کے وہ پیغام عطا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس وقت بارگاہ سرمدی سے تین عطیے مرحمت ہوئے۔ امت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی گئیں اور حضرت موسیٰ کے مشورہ پر نبی رحمت نے بارگاہ خداوندی سے تخفیف کی درخواست کی اور اخیر میں پانچ نمازیں رہ گئیں، دوسرا عطیہ خداوندی یہ تھا کہ سورہ بقرہ کی آخری آیتیں دی گئیں جن میں اسلام کے عقائد و ایمان کی تکمیل اور دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت تھی اور تیسرا مژدہ جانفزاء یہ تھا کہ امت محمدیہ میں سے ہر وہ شخص جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو پروانۂ کرم مغفرت سے سرفراز ہوگا۔ راز و نیاز کے اس ناقابل تصور اور ناقابل

بیان موقع پر یہود اور قریش کو بیت المقدس اور خانہ کعبہ کی تولیت سے معزول کر کے نبی آخر الزماں کو بیت المقدس اور خانہ کعبہ کی تولیت کا قیامت تک کے لئے منصبِ عظیم عطا کیا گیا اور اس منصب عظیم کی گراں باری سے کما حقہ سبکدوش ہونے کے لئے بارہ ربانی احکام سے امت محمدیہ کو سرفراز کیا گیا، شرک نہ کر، ماں باپ کی عزت و اطاعت کر، حق والوں کا حق ادا کر، اسراف نہ کر اور افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کر، اپنی اولاد کو قتل نہ کر، زنا کے قریب نہ جا، ناحق کسی کی جان نہ مار، یتیم سے بہتر سلوک کر، اپنا عہد پورا کر، ناپ تول میں پیمانہ و ترازو کو درست رکھ، نامعلوم بات کی پیروی نہ کر، زمین پر اکڑ کر نہ چل۔

سیر آسمانی کے بعد آپ زمین پر تشریف لائے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ تمام انبیاء کرام کو یہاں موجود پایا۔ نماز کا وقت تھا سرور عالم امام الانبیاء منصب امامت سے سرفراز ہوئے اور مسجد اقصیٰ سے مسجد حرام کی جانب روانہ ہوئے۔

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر ناسوتی کو "اسراء" اور مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ اور مابعد کے سفر لاہوتی کو "معراج" کہتے ہیں۔

رضائے الٰہی اور بلند مقاصد کے حصول کی خاطر پامردی اور جاں سوزی کے ساتھ راہ میں آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنا اور اس راہ کے نشیب و فراز کو روشن ضمیری اور خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کرنا ہی منزل مقصود کے حصول کی شاہ کلید ہے اور اگر اس کی رضا شامل ہے تو پھر ان پرخار وادیوں کی پر کاہ کے برابر بھی حقیقت نہیں ؎

گلہ نہیں جو گریزاں ہوں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت ہزار میخانے

پھر معراج کی بشارت ہجرت کی شکل میں پوری ہوئی اور وہ وقت آیا جب لات

سرنگوں ہوا اور طائف کا دکھیارا دکھیاروں کا سہارا بنا اور نخوت قریش اس خدائے محمد کے آگے سجدہ ریز ہوئی جس خدائے محمد کا نام قریشیوں کو خانہ خدا میں بھی سننا گوارا نہ تھا۔

معراج کا واقعہ تاریخ انسانیت کا ایک زریں باب ہے۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہ وسیع کائنات اس مشت خاکی کی بازی گاہ ہے اور اس کی ناصبور طبیعت کے لئے سکون موت کے مترادف ہے۔ پیہم تگ و دو ہی اس کی زندگی کا راز اور اس کی جدت فکر و خیال کا طرہ امتیاز ہے وہ عالم رنگ و بو پر قناعت نہیں کرتا بلکہ ہر دم ایک عالم نو کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ایک میدان میں تخم ریزی کا غیر متوقع انجام اس میں مایوسی پیدا نہیں کرتا بلکہ تازہ دم ہو کر تیشۂ فکر و عمل کے ذریعہ سنگ گراں سے جوئے شیر نکالنے کی پیہم سعی پر اس کو آمادہ کرتا ہے۔

عیدالفطر اخوت اور محبت کا پیغام

(تاریخ نشر ۱۰ر فروری ۱۹۹۷)

اسلام سراپا اخوت و محبت کا پیغام ہے۔ اس کی ہر تعلیم سے اس کی یہ صفت نمایاں ہے۔ انسانی فطرت کی خوشی اور غم کے جذبات کی رعایت فطری انداز میں اس طرح کی گئی ہے کہ فطرت انسانی خود بخود اس کو اپنے قلب کی دھڑکن اور دل کی آواز تصور کرتی ہے اور اس کی انجام دہی میں اسے وہی مسرت و شادمانی حاصل ہوتی ہے جو ایک پروانے کو شمع پر اپنی جان نثار کرکے۔

عیدالفطر کے موقع پر جس مساوات اور اخوت و محبت کا اظہار ہوتا ہے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم اور اس کی روح پرور ہدایت کا عکس جمیل ہے۔ شعبان کا ماہ تمام جب ہلالِ رمضان بن کر افق چرخ نیلی فام پر اپنے رخ زیبا سے پردۂ طلائی سرکاتا ہے تو مسرت و شادمانی کی دولت بے بہا سے قلب مسلم مالامال ہو جاتا ہے۔ ہر چہرہ پر مسرت اور ہر دل میں اخوت کی شمع فروزاں ہو جاتی ہے اور ہلال عید تک اس کی لو میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے افطار کے موقع پر، تراویح میں پڑوسیوں، دوستوں، حاجت مندوں اور ناداروں کی دل داری، ان کی میزبانی، اور ان کے ساتھ محبت و احترام اور رحمت و شفقت کے ابر عمل سے اس جذبہ کی آبیاری ہوتی ہے۔ جس کی مشق سات سو بیس گھنٹے کرائی جاتی ہے۔ ہلال رمضان اگر اس کی ابتداء ہے تو ہلال عید اس کی انتہا۔ ہلال رمضان اگر آغاز ہے تو ہلال عید اس کا انجام۔ ہلال رمضان اگر تخم ہے تو ہلال عید شجر سایہ دار۔

روزہ کی فرضیت کا بنیادی مقصد روزہ دار کے اندر تقویٰ پیدا کرنا ہے۔ جب دل

میں تقویٰ کی کیفیت جاں گزیں ہو جاتی ہے تو چشم ولب، دست وپا، ابرو مژہ اور قلب وجوارح سے صادر ہونے والے اعمال میں اخلاص وللّٰہیت اور خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا اظہار اقبال نے یوں کیا ہے

خاکی ونوری نہاد بندہ مولیٰ صفات

خالق کائنات نے ارشاد فرمایا:

''اے ایمان والو! تم پر رمضان کے روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ کی کیفیت پیدا ہو''۔ (البقرہ ۱۸۳)۔

اسی لئے روزہ دار کو ہر ایسی چیز سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے جس سے صفت تقویٰ کی افزائش پر اثر پڑے۔ نبی آخر الزماں نے ارشاد فرمایا:

''روزہ لغو چیزوں سے روکنے کی ڈھال ہے اگر تم میں سے کوئی روزہ رکھے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ فحش کلامی سے پرہیز کرے نہ بے ہودہ گوئی کرے اور نہ جھگڑے اگر کوئی اس کو برا بھلا کہے یا جھگڑنے پر آمادہ ہو جائے تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں''۔ (بخاری ومسلم)۔

رمضان کے مہینہ میں روزہ کا عمل بارگاہ خداوندی میں سب سے پسندیدہ عمل ہے کیوں کہ ہر عمل میں ریاکاری کا امکان ہے لیکن روزہ کے عمل میں ریاکاری کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں ہے اس لئے اس عمل بے ریا کا اجر بھی بے پایاں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

آدمی کو ہر عمل کے بدلے میں دس نیکیاں سات سو گنا تک دی جائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ تو خاص میرے لئے ہے میں ہی اس کا بدلہ دونگا اس لئے کہ اس کا کھانا

پینا چھوڑنا اور خواہش کا ترک کرنا میری خاطر تھا''۔ (مسلم)۔

روزہ دار کی ہر ادا دولت کدہ ایزدی میں محبوب ہے یہاں تک کہ خلومعدہ کی وجہ سے روزہ دار کے منہ میں جو بو پیدا ہو جاتی ہے وہ بو اللہ تعالیٰ کو مشک سے زیادہ پسند ہے۔ شیطان حصار دل پر بار بار نقب زنی کرتا ہے تاکہ دل میں تقویٰ اور خشوع کی کیفیت پیدا نہ ہو اور خدا چاہتا ہے کہ روزہ دار کا دل خشوع وتقویٰ سے بھر جائے۔ اس لئے شیاطین کو اس ماہ میں مقید کر دیا جاتا ہے ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین مقید کر دیئے جاتے ہیں''۔ ان حالات میں محبت وشفقت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ ہر روزہ دار کی خواہش ہوتی ہے کہ افطار کے وقت زیادہ سے زیادہ روزہ دار اس کی پیش کردہ چیزوں سے افطار کرے تاکہ ہمدردی واخوت کا اظہار بھی ہو اور افطار کرنے والے کے روزہ میں ثواب کے اعتبار سے یہ بھی شریک ہو جائے نادار ومفلس جو عام دنوں میں کسمپرسی کی زندگی گذارتے ہیں رمضان میں اس کے دسترخوان پر بھی متنوع قسم کے کھانے ہوتے ہیں جس سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔

محبت وہمدردی وغم گساری کی باد بہاری کے جھونکے چلتے ہیں اور اخوت کا ابر کرم پوری آبادی پر سایہ فگن ہو جاتا ہے اور امتیاز من وتو ختم ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان اس حدیث پر عمل کرتا ہے جس میں فرمایا گیا:

ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ سے اچھا برتاؤ کرے۔ (مشکوٰۃ)۔

رمضان کا پورا مہینہ اس طرح گذرتا ہے کہ بے کسوں اور مفلسوں کے دل کی کلیاں

کھل جاتی ہیں اور رحمت خداوندی کی مادی اور روحانی نوازشات کے طفیل دلوں میں مایوسی یا کمتری کا احساس پیدا نہیں ہو پاتا لیکن عید کے دن جب اہل ثروت نئے لباس زیب تن کئے ہوئے عید گاہ کا رُخ کریں گے تو غریبوں پر کیا گزرے گی اس لئے شریعت نے ہر صاحب استطاعت مسلمان پر صدقہ فطر واجب قرار دیا تا کہ مفلس بھی اس عطائے خداوندی کے ذریعہ صبر و شکر کے جذبہ کے ساتھ اچھے لباس میں ملبوس ہو کر دوگانہ ادا کرے۔

ان حالات میں جب ایک مسلمان کے شب و روز گذرتے ہیں تو غفور رحیم کے دربار سے پروانہ مغفرت عطا ہوتا ہے جس کا اظہار زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوتا ہے۔

''جو شخص ایمان کے ساتھ ثواب کی امید میں رمضان کے روزے رکھے تو اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں''۔

دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا عشرہ رحمت ہے، درمیانی عشرہ مغفرت ہے اور آخری عشرہ جہنم سے آزادی ہے''۔

لطفِ خداوندی اور رحمت ایزدی کا کوئی خاص موسم نہیں لیکن ماہ رمضان لطف و انعام کا موسم بہار ہے اور ملا اعلیٰ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس ماہ کی برکتیں جن بختاور اور بانصیب افراد کے حصہ میں آئی ہیں وہ بھی داد و دہش کے ذریعہ لطف و انعام کا مظاہرہ کریں اور اخوت و محبت کی ایسی فضا قائم کریں کہ شکستہ دلوں، فسردہ چہروں اور بادہ فقر سے مخمور آنکھوں کو سامانِ تسکین میسر ہو اور ہر چہرہ پر مسرت اور ہر دل میں خوشی کی قندیل روشن ہو۔

رمضان المبارک اور عید الفطر کی حقیقی لذت اور اس کے دنیاوی و اخروی اجر کے

مستحق وہی نیک طالع افراد ہیں جن کے لوح دل پر رمضان کا حقیقی صحیح اور ارادی شعور ثبت ہو جائے اور وہ شعور کردار کی صورت اختیار کر لے کیونکہ کردار ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور کردار کی عظمت ہی انسان کو اشرف المخلوقات کی خلعت عطا کرتی ہے اور انسان کو انسان کے حقیقی منصب پر سرفراز کرتی ہے اس وقت انسان کا دل جلوہائے ربانی کی ضیاپاشیوں کو اپنے اندر جذب کرنے کا سزاوار ہوتا ہے اس وقت قدسیوں کو بھی اس جلوہ گاہ ربانی پر رشک آتا ہے۔

رمضان کا مبارک مہینہ اور اس کی سعید ساعتیں رخصت ہوئیں قابل صد رشک ہیں وہ قدسی نفوس جن کے نصیبے میں اس کی قدردانی آئی اور لائق مبارک باد ہیں وہ منصب کردار کے اعلیٰ مقام حاملین جو اس کے روحانی شب و روز سے فیض یاب ہوئے اور اخوت و محبت کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی۔ خدا کرے کہ عید الفطر کی اخوت و محبت کے اس پیغام کو ہم یاد رکھیں اور نفرت و عداوت اور بغض و حسد کی شب تاریک میں محبت و آشتی کی شمع جلا کر حتی المقدور امن و امان اور خلوص و محبت کو کردار کا روپ عطا کریں۔

عیدالاضحیٰ ایثار اور قربانی کا درس

(تاریخ نشر ۱۸/اپریل ۱۹۹۷)

آج سے تقریباً چار ہزار سال پہلے واقعات و حادثات کی دنیا میں ایک ایسے انوکھے نادر اور محیر العقول واقعہ سے چشم فلک روشناس ہوئی جس کی نظیر سے کائنات ابھی تک نا آشنا اور نامانوس تھی۔ خودسپاری، تواضع، فدائیت، عبدیت اور اطاعت و فرمانبرداری کی ایسی مثال قائم ہوئی جس پر انسان اور انسانیت جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ قربانی صرف گوشت و پوست کی قربانی نہ تھی بلکہ دلی جذبات کی قربانی تھی۔ کائنات اور کائنات کی دلربا، دلکش اور دلآویز اشیاء اور حقائق سے منہ موڑ کر خالق کائنات کی طرف یکسو ہونے کی قربانی تھی۔

جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ اعلان کیا کہ

''میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو زمین کو پیدا کیا موحد بن کر اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں اور یہ اعلان کیا کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے''۔

اس کائنات کی فتنہ سامانی بھی عجیب ہے۔ موحد اعظم نے جب اپنی خدا پرستی اور خودسپاری کی سرگذشت خالق کائنات کے سامنے بیان کی تو دعوائے محبت اور دعوائے عبدیت میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمائشوں کی بھٹی سے گذارا گیا کیونکہ حالات سے نبردآزما ہونے کے بعد ہی انسان میں عظمت پیدا ہوتی ہے اور وہ اس عظیم کائنات کی پیشوائی کا کسی قدر مستحق بنتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

''اور جب ابراہیم علیہ السلام کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی

پھر اس نے انکو پورا کیا''۔

جب حضرت ابراہیمؑ اپنے رب کی آزمائش میں پورے اترے تو عرش خداوندی سے ایک مژدہ جانفزا آیا کہ اس آزمائش میں میری کسوٹی پر چون کہ تم پورے اترے ہو اس لئے اس کے صلہ میں تم کو لوگوں کے لئے پیشوا بنانے والا ہوں۔

اس طرح ''قربانی'' اپنے وسیع تر مفہوم میں ملت ابراہیمی اور حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کا طرہ امتیاز بن گئی۔ حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا اور اس امر خداوندی پر باپ اور بیٹے دونوں نے لبیک کہا۔ اس عمر میں جب باپ کو سہارے کی ضرورت ہوتی ہے رب کائنات اور رب رحیم کا منشاء یہ نہیں تھا کہ باپ سے آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کا سکون چھین لے بلکہ اس دل کا امتحان تھا جس نے صرف ایک رب رحیم کی محبت کا دعویٰ کیا تھا۔ محبت سب کچھ گوارا کر سکتی ہے لیکن شرکت کے لئے اس کے داماں کی پہنائی میں گنجائش نہیں ہوتی۔ پہلے بچے سے جو محبتیں، شفقتیں اور امیدیں وابستہ ہوتی ہیں یا ہو جایا کرتی ہیں، اس سے ایک دنیا واقف ہے۔ حضرت ابراہیم نبی تھے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ بشر تھے اور بشری صحت مند اور پاکیزہ تقاضے نبوت کے منافی نہیں ہوتے۔

لیکن مراحل محبت میں بلکہ منازل عشق میں آخری منزل ایسی آتی ہے جہاں ان جائز بشری جذبات کی قربانی اس آخری مرحلہ میں کامیابی کی شاہ کلید تصور کی جاتی ہے حضرت ابراہیم اس امتحان میں کامیاب ہوئے جس ذات نے امتحان لیا اس کی گواہی ہے کہ:

''اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا''

اور وہ ذات جس کی ادنیٰ محبت کا مقابلہ کائنات کے تمام انسانوں، جنوں،

درختوں، پرندوں اور درندوں کی مجموعی محبت نہیں کرسکتی بھلا اس کی محبت حضرت اسماعیلؑ کے خون سے سرزمین منیٰ کو کیوں کر ممکن تھا کہ لالہ زار بننے دنیا گوارا کرتی رحمتِ حق اور شفقت ربانی جوش میں آئی اور ارشادِ خداوندی ہوا:

''اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا'' جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہ السلام اس آزمائش میں پورے اترے تو ان کو ایک عظیم ترین ذمہ داری دے کر عظیم ترین منصب سے سرفراز کیا گیا۔ ارشاد خداوندی ہے ''اور ہم نے ابراہیم واسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک کرو''۔

چھوٹا انسان جب کسی عظیم منصب پر فائز کیا جاتا ہے تو وہ انسان جو اپنے بنانے والے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ رفتہ رفتہ اپنی حقیقت کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ منصب عظیم میری صلاحیتوں کے نتیجہ میں مجھ تک چلتا ہوا آیا ہے لیکن وہ مردمومن جس کی دنیا کی حقیقت اس عالم محسوسات سے بالکل الگ ہوتی ہے وہ منصب عظیم کو سرتاپا فضل الٰہی اور نوازش ربانی تصور کرتا ہے۔ جب حضرت ابراہیم کو خانہ کعبہ کی تعمیر کے عظیم ترین منصب اور انسانوں کی پیشوائی کے مرتبہ اعلیٰ سے سرفراز کیا گیا تو ان میں انکساری پیدا ہوئی۔ انسانیت ابراہیمی کی عظمت کی کہانی قرآن کریم کی زبانی سنیئے:

''جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو یہ دعا مانگ رہے تھے کہ ہمارے رب ہماری اس تعمیر کو ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے ۔اے ہمارے رب ہم کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو اور ہم کو اپنے حج کے ارکان دکھا اور ہماری کوتاہیوں سے درگذر فرما۔ تو بڑا انصاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے اور اے رب ان لوگوں میں خود ان ہی کی قوم سے ایک

رسول اٹھا جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور دانا ہے''۔

اور اب حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اس قربانی اور اطاعت وفرمانبرداری کے نتیجہ میں تواضع، للّٰہیت اور اطاعت کی ایک علامت بن گئی، جس کا عمل اسوہ ابراہیمی کے مطابق ہو وہ دیندار اور عقل مند اور جس کا عمل اسوہ ابراہیمی کے خلاف ہو وہ بددین ہے ارشاد خداوندی ہے:

''اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقہ سے نفرت کرے جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کرلیا ہو اس کے سوا کون یہ حرکت کرسکتا ہے۔ ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لئے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا''۔

اور یہ مرتبہ بلند کیوں کر ملا۔ خود مرتبہ بلند عطا کرنے والے کی زبانی سنیئے:

''اس کا (حضرت ابراہیم) حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا، مسلم ہوجاؤ اس نے فوراً کہا میں مالک کائنات کا مسلم ہوگیا اسی طریقہ پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی''۔

عرب اپنے جاہلی دستور کے مطابق جب قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیوار پر لگاتے تھے تاکہ خدا سے تقرب حاصل ہوجائے اور یہود میں یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے نبی آخرالزماں ﷺ نے حضرت ابراہیم کی جانسپاری کے واقعہ کی حقیقت کو واشگاف فرمایا اور ان خود ساختہ اور فرسودہ دوراز کار تاویلاتی رسموں پر قیامت تک کے لئے خطِ نسخ پھیر دیا۔

سورہ حج میں صاف صاف اور واضح الفاظ میں یہ اعلان کردیا گیا کہ ''خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا۔ اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے''۔

خطوط غالبؔ اپنے عہد کے آئینہ دار ہیں

(تاریخ نشر ۴راگست ۱۹۹۷)

دلی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں انحطاط وانتشار کی ایک زندہ علامت بن چکی تھی۔ طاقت کی غیر مرکزیت نے دلی کی علمی اورادبی محفلوں کوشہر خموشاں میں تبدیل کردیا تھا۔ میرؔ نے اس شہر خموشاں سے لکھنو کا رخت سفر باندھا اور جب شمع انکے سامنے لائی گئی تو دلی کی عظمت رفتہ کی کہانی کچھ اس طرح سنائی۔

کیا بود وباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
مجھ کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے بربا د کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

غالبؔ کے حصے میں یہی اجڑی ہوئی دلی آئی، لیکن اس دور انحطاط میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، اور شیفتہؔ کے پرسوز نغموں کے ذریعہ دلی کی عظمت رفتہ ایک بارپھر لوٹ آئی اور سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید، مولانا فضل حق خیر آبادی، نواب صدرالدین خان آزردہؔ اور امام بخش صہبائیؔ نے علم وعمل اور عرفان وآگہی کی وہ شمع روشن کی کہ دلی پھر مرکز توجہ اور مرجع اہل کمال بن گئی۔

غالبؔ نے زندگی کی چوہتر بہاریں دیکھیں ۱۷۹۷ء میں اس عالم فانی میں قدم رکھا

اور ۱۸۶۹ء میں عالم بقا کو اپنی آخری آرام گاہ بنایا۔ غالبؔ کو ہم بحیثیت شاعر زیادہ جانتے ہیں اور بحیثیت نثر نگار کم، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح غالبؔ ایک عظیم شاعر تھے اسی طرح ایک عظیم نثر نگار بھی تھے۔ اردو نثر میں غالبؔ کا کل سرمایہ ان کے خطوط ہیں جو ۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۹ء تک کی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں۔ نثر کی عمر اگر چہ کہ بہت مختصر ہے لیکن اسکے باوجود اسکی اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے غالب کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ عود ہندی کے نام سے ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا۔ ان کے اردو خطوط کا دوسرا مجموعہ اردوئے معلیٰ کے نام سے ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں مولانا الطاف حسین حالیؔ کی فرمائش پر پہلا اور دوسرا حصہ یکجا کر کے شائع کیا گیا۔ ایک مجموعہ، مکاتیب غالبؔ، کے نام سے امتیاز علی خان عرشی نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا اس طرح غالب کے خطوط کا ایک اور مجموعہ ''نادرات غالب'' کے نام سے ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ غالب کے فارسی مکتوب نگاری کے مقابلہ میں اردو مکتوب نگاری کی مدت صرف بیس سال ہے۔ غالب کی شام زندگی میں فارسی مکتوب نگاری کا رواج تقریباً ختم ہو چکا تھا اسلئے اردو مکتوب نگاری کے بجائے فارسی مکتوب نگاری بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی تھی اسطرح فارسی مکتوب نگاری جس ژرف نگاہی، جگر کاوی درازنفسی اور جدت طرازی ومحنت پژوھی کا متقاضی تھی غالبؔ اپنے شام زندگی میں ان ناز برداریوں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

غالبؔ نے اردو زبان میں خطوط نویسی کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا اور مولانا حالی نے لکھا ہے کہ مرزا کی اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ انکے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی۔ غالب کے خطوط کی بنیادی خصوصیت یہ کہ اس میں غالبؔ کی شخصیت کی طرح بے تکلفی، صداقت، خلوص، بے باکی اور برجستگی ہے۔ خطوط غالبؔ کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں،

بچپن کے حالات، شادی کے اثرات معاشی پریشانیاں، قید کا واقعہ، غدر کے حالات، ان تمام موضوعات پر مکاتیب غالب سے روشنی پڑتی ہے۔ غالب نے مکاتیب میں اہم واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت کا عکس ان مکاتیب میں نظر آتا ہے۔ غالب کے خطوط سے اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ماحول کی بھی وضاحت ہوتی ہے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے دلی کس طرح متاثر ہو رہی تھی، اس زمانے کے شعراء اور ادباء کے ادبی مباحث کیا تھے۔ ان سب پر غالب کے مکاتیب سے روشنی پرتی ہے

منشی حبیب اللہ کے نام اپنے خط میں والد کی وفات کا ذکر کرتے ہیں:

باپ میرا عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا، کئی برس وہاں رہا وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی، والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا راؤ راجہ بختیاور سنگھ کا نوکر ہوا وہاں کی لڑائی میں مارا گیا۔ چودھری عبدالغفور خان سرور کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں۔ ''میں پانچ برس کا تھا کہ باپ مرا نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان مرحوم دس ہزار سال مقرر ہوئے۔ انہوں نے نہ دیئے مگر تین ہزار روپے سال''۔

غالب کی عمر ابھی تیرہ سال تھی کہ ۱۲۲۵ھ میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خان معروف کی چھوٹی لڑکی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ امراؤ بیگم کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی شادی کے دو تین سال کے بعد غالب نے مستقل طور پر دہلی میں قیام کیا اب ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ زندگی کی اس تبدیلی کے متعلق مرزا غالب علاؤالدین احمد خان کو اپنے مخصوص انداز میں

لکھتے ہیں ''ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا کہ عالم ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور شہر دلی کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا گیا۔ نظم اور نثر کو مشقت ٹھہرایا برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا تین برس تک بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ کر لائے اور پھر اس مجلس میں بٹھا دیا جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں، پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار .... گذشتہ سال بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ کر دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا کچھ دن کم دو مہینے رہا تھا کہ پھر پکڑا آگیا اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی نہ رہی۔

غالب کے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے ایک بھی پندرہ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ ایک خط میں میاں داد خان سیاح کو ان کے بیٹے کی وفات پر لکھتے ہیں ''تمہارے یہاں لڑکے پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلو ہو کر مجھ کو بہت غم ہوا، بھائی اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کی ۷۴ برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی تم ابھی جوان ہو حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم البدل دے''۔

میر مہدی حسین مجروح کے نام دہلی کے خونچکاں حالات کی قلمی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں۔

وبا کو کیا پوچھتے ہو قدر انداز قضاء کے ترکش میں ایک یہی تیر باقی تھا قتل ایسا عام لوٹ ایسی سخت کال ایسا بڑا وبا کیوں نہ ہو لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے ۔

ہوچکیں غالبؔ بلائیں سب تمام   ایک مرگ ناگہانی اور ہے

اپنی معاشی حالت کی عکاسی یوسف مرزا کے نام ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں۔

''میری جانِ خدا تیرا مہربان، جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں اس کے بعد نہ کہیں سے قرض کی امید ہے کہ اور نہ کوئی چیز رہن و بیع کے قابل ہے اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۱۸۵۷ء میں جب غدر کا ہنگامہ ہوا اس وقت غالبؔ کی عمر ۶۲ رسال کی تھی۔ اس ہنگامے کے بعد غالبؔ کا دوبارہ رامپور سے تعلق گہرا ہوگیا یہ زمانہ مالی اعتبار سے غالبؔ کے لئے کسی طرح سازگار تھا لیکن اب عمر بھی خاصی ہوچکی تھی چاروں طرف سے جسمانی ضعف نے گھیر رکھا تھا۔ زندگی کے اس دور کی تصویر ان کے آخری دور کے خطوط میں ملتی ہے۔ مرزا تفتہ لکھتے ہیں'' آؤ مرزا تفتہ میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو۔ سامعہ مرگیا تھا اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں ہے حافظہ گویا کبھی نہ تھا شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی''۔

زندگی کے آخری دنوں کے حالات غلام حسنین قدر بلگرامی کو ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

''برس دن صاحب فراش رہا ہوں، چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خونچکاں ہے، ایک درجن پھائے لگ جاتے ہیں جسم میں جتنا لہو تھا پیپ ہو کر نکل گیا تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کر جیتا ہوں، کبھی کھاتا ہوں کبھی پیتا ہوں''۔

مفتی نبی بخش کو اپنے ہمعصر مومن خان کے انتقال پر لکھتے ہیں'' سنا ہوگا تم نے مومن خان مرگئے، آج ان کے مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے

ہیں، ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں مومن خان میرا ہمعصر تھا اور یار بھی تھا۔ یہ شخص بھی اپنے وضع کا اچھا کہنے والا تھا طبیعت اس کی معنیٰ آفریں تھی''۔

نمونے کے طور پر ایک اور خط ملاحظہ فرمایئے جس میں غالبؔ نے زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔'' ناتوانی زور پر ہے بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، کاہلی، سستی، گرانجانی ہے، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سفر دور دراز درپیش ہے، زادِراہ موجود نہیں خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر ناپرسیدہ بخش رہا تو خیر اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقرّ ہے اور ہاویہ زاویہ ہے''۔

مشتے نمونہ از خروارے چند خطوط پیش کیئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے خطوط فنی اور جمالیاتی اعتبار سے اپنی ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سادگی بھی ہے اور رعنائی بھی، ندرت خیال کا بانکپن بھی ہے اور زندگی کے حقائق کی گنگا جمنی بھی، اچھوتے سلوک کی دلکشی بھی ہے اور تخیل کی بلند پروازی و فنکاری بھی۔

اردو مکاتیب میں جس زاویہ سے بھی خطوط غالبؔ پر نظر ڈالی جائے آثار الصنادید کے مولف سر سید احمد خان کے الفاظ میں قلم ان کا معنیٰ روشن کی تراوش سے فوارہ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور۔

دکن میں اردو غزل کا آغاز اور اس کا ارتقاء

(تاریخ نشر ۲۹ ستمبر ۱۹۹۷)

دکن میں اردو غزل کا آغاز اور اس کا ارتقاء ایک وسیع اور دلچسپ موضوع ہے اور دکن کی تاریخ ادب اردو کا ایک زریں باب۔ یہ بات ایک امر مسلم کی حیثیت رکھتی ہے کہ دکن میں شعروسخن کی ابتداء غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم سے ہوئی اور اس طرح مثنوی کو خشت اول ہونے کا مقام وشرف نصیب ہوا اور اس پر قصیدہ وغزل کی دیواریں چنی گئیں۔ دکن کی بہمنی سلطنت علم پرور اور معارف نواز تھی اور اس کا بانی حسن خان علاؤالدین بہمنی ایک بیدار مغز اور علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے جانشین احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ تا ۸۶۷ ھ) کا درباری شاعر نظامی تھا اس نے ایک مثنوی لکھی جو کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے مشہور ہے۔ سلطان محمد شاہ بہمنی متوفی ۱۵۱۶ء کے دور میں مشتاق نامی ایک شاعر گذرا ہے۔ اس نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں دکنی زبان میں ایک قصیدہ لکھا تھا اور اس کی غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں اس طرح مشتاق دکن میں اردو کا پہلا غزل گو شاعر قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد جس غزل گو شاعر کا سراغ ملتا ہے وہ ہے حسن شوقی، اس کا تعلق قطب شاہی عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں سے تھا۔ شوقی کی زندگی ہی میں اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ ابن نشاطی نے اپنی مثنوی ''پھول بن'' میں اس کی تعریف کی ہے حسن شوقی کی تاریخ ولادت ۹۴۸ ھ ہے۔ اس کی ۳۱ غزلیں اب تک دستیاب ہو چکی ہیں۔

شوقی کی غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ و روپ کا حصہ ہیں۔ شوقی کے اشعار میں غزل کے وہ ابتدائی نقوش ہیں جہاں خود غزل کی

روایت جم کر پھیل کر ایک انوکھے انداز میں اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار۔

عجب کیا ہے جو پاوے توں بقا توشہ فنا کا لے
اثر تیرے دھن کا کچھ اگر راہ عدم پکڑے
اگر مجنوں کی تربت پر گذر جاؤں دیوانہ ہو
کہ مجنوں حال میرے کوں جو دیکھے درکفن لرزے

شوقی کے یہاں قافیہ اور ردیف دونوں غزل کا جزو بن کر آتے ہیں۔ اگر ترتیب زمانی کے لحاظ سے بہمنی دور سے لے کر عادل شاہی، قطب شاہی دور تک غزلوں کی روایت کا سراغ لگایا جائے تو ہمیں غزل کی ایک باقاعدہ روایت بنتی سنورتی اور پھیلتی دکھائی دے گی شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے غزل نہ کہی ہو، فیروز محمود، خیالی، وجہی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، تانا شاہ، ابراہیم عادل شاہ اور علی عادل شاہ شاہی، لیکن ان شعرا کے مقابلہ میں نصرتی ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ اس کی غزل پر مثنوی اور قصیدہ کی طرح بیجاپوری اسلوب کا رنگ غالب ہے۔ دکنی غزل کے مزاج کے عین مطابق نصرتی کی غزل کا موضوع بھی عورت ہے جس سے وہ غزل کے اشعار میں اپنے عشق و محبت کے جذبات و خواہشات کا اظہار کرتا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

تجھ دل نے بی نہا لگے مجھے چک میں روز وصل
دتی شب فراق تیری زلف نے بڑی
عالم کی تب نے نصرتی پروا بیٹا مدام
جب تجھ شراب حسن کی مستی اسے چڑی

غزل کی روایت آگے بڑھتی رہی۔ اس میدان میں سید میراں میاں خاں ہاشمی

(۱۱۰۹ھ/۱۶۹۷ء) آئے اور ایک منفرد مقام کے حامل بنے۔ وہ علی عادل شاہ ثانی م۱۰۸۳ھ۔ ۱۶۷۲ء) کے عہد کا ممتاز شاعر اور شاہ ہاشم مہدوی کا مرید تھا۔ شاہ ہاشم نے اپنے نام کی مناسبت سے سید میراں کو ہاشمی کے تخلص سے نوازا۔ ہاشمی بچپن ہی میں آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ انہوں نے مثنویاں بھی لکھیں۔ قصیدے اور غزلیں بھی۔ اس دور میں ایک تبدیلی واضح طور پر یہ محسوس ہوتی ہے کہ اب غزل بحیثیت صنف سخن ابھر کر مقبول ہوگئی ہے۔ شعراء کے یہاں مثنویوں اور نظموں کے علاوہ خاصی بڑی تعداد میں غزلیں بھی ملنے لگی ہیں، دیوان ہاشمی ۳۲۸ غزلوں پر مشتمل ہے۔ ہاشمی کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں ایک ہی بات یا جذبے کے مختلف پہلوؤں کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

زیادہ تر غزلیں اسی مزاج کی حامل ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہیکہ غزلوں میں اشعار کی تعداد دس پندرہ سے لیکر بیالیس تک ملتی ہے۔ جہاں طویل غزلوں سے ہاشمی کی پُرگوئی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ابھی غزل کے مزاج میں مثنوی یا طویل نظم کا مزاج جاری و ساری ہے۔ اس میں گھٹاؤ کے بجائے پھیلاؤ اور ارتکاز کے بجائے توضیح کا عمل کام کررہا ہے۔ تجربے کو سمیٹ کر غزل کے دو مصرعوں میں بیان کردینے کا تخلیقی عمل ابھی غزل میں نہیں آیا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ہاشمی کی غزل شاہی اور نصرتی کی غزل کے مخصوص مزاج کو آگے بڑھا رہی ہے اور یہاں بھی رنگ رلیاں منانے، گل کھلنے اور داد عیش دینے کا جذبہ کارفرما ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ہاشمی نے زیادہ تر اپنی غزلوں میں عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان اور محاورے میں بیان کیا ہے اور یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے ریختی کی صنف سے بے حد قریب ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

تیرے سنگار کے بن میں تما شا میں نول دیکھا
سُرو کے جھاڑ کو نرمل اناراں سے دو پھل دیکھا
ہوا ہے ہاشمی مالی تیرے سنگار کے بن میں
لگے تجھ قد کی ڈالی بر کچن دو پھل نچھل دیکھا

ہاشمی کی غزلیں پڑھتے ہوئے محمد شاہی دور کے میاں آبرو کی غزلیں یاد آنے لگتی ہیں۔ جہاں تہذیبی سطح پر یہی عمل ہو رہا ہے۔ فنی اعتبار سے ہاشمی اس دور کا صف اول کا شاعر ہے اور اس کا نام نصرتی کے بعد ہی لیا جانا چاہئے۔ زبان و بیان کی سطح پر وہ بیجاپوری اسلوب کے نئے عبوری دور کا شاعر ہے جس کا رشتہ ناطہ ایک طرف اسلوب بیان کی پرانی روایت سے قائم ہے اور ساتھ ساتھ جدید اسلوب کے امکانات بھی اس کے ہاں اپنا زور دکھا رہے ہیں۔

اب ہماری نظر محمد امین ایاغی پر پڑتی ہے جو نصرتی، ہاشمی، مومن اور مرزا کے ہمعصر تھے اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۸۳ھ۔ ۱۶۷۲ء) کے دور میں زندہ تھے۔ انہوں نے غزل گوئی میں ایک اچھوتے اسلوب کی بنیاد ڈالی، ان کا درویشانہ مزاج اور زبان و بیان کی سادگی ان کی غزلوں میں رنگ جماتی ہے۔ ایاغی کی غزلوں کا موضوع بھی محبوب ہے لیکن یہاں عشق میں شاہی اور نصرتی کی طرح بوالہوسی نہیں ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ عشق سے شخصیت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ ایاغی کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے ہمارا دھیان حسن شوقی کی غزلوں کی طرف جاتا ہے اور کبھی عراقی اور امیر خسرو یاد آنے لگتے ہیں، ایاغی کی غزلوں میں ایک ایسی رچاوٹ محسوس ہوتی ہے جو اس دور کے غزل گو شعراء میں کم کم نظر آتی ہے۔ یہاں غزل میں ہیئت کے اعتبار سے ایک باقاعدگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ قدیم شعراء کی طرح صرف ردیف پر غزل کی زمین قائم نہیں کی گئی ہے بلکہ قافیہ اور ردیف سے غزل کا آہنگ قائم کیا گیا ہے۔ ایک غزل

میں گال جمال اور بال قافئے ہیں اور انکھیاں ردیف ہے ایک اور غزل میں سات، گھات، رات، بات قافئے ہیں اور چاندر دیف ہے۔ ایاغی کی غزل میں ایک نئے مزاج کا احساس ہوتا ہے جو نصرتی شاہی اور ہاشمی سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں سنجیدگی اور ایک قسم کے ٹھہراؤ کا پتہ چلتا ہے جہاں زبان کی اجنبیت اثر و تاثر کو پردوں میں نہیں چھپا رہی ہے بلکہ سوز و گداز کی ہلکی ہلکی آنچ ہمیں بھی لگ رہی ہے۔ ایاغی کے یہاں سادگی کو پانے کا احساس ہے جو ایک طرف حسن شوقی کی غزل کو آگے بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف ولی دکنی کی آواز سے بھی مل رہی ہے۔غزل کی روایت میں محمد امین ایاغی کی بھی اہمیت ہے۔ملاحظہ ہوں غزل کے چند اشعار ۔

میرے من منے آج اودھیان ہے　　کہ اس مست خوں ریز کا دھیان ہے
جداں تے ترا زلف دیکھا ہوں میں　　تداں تے مرا من پریشان ہے
ہوا باد و باراں میرا جیو آج　　ترے عشق کا دل میں طوفان ہے
گہنہ کیا ہوا ہے سو معلوم نیں　　مجھے دیکھ کر آج انجان ہے

گولکنڈہ کے ابتدائی دور کے شعراء فیروز، محمود، خیالی غزل اور مثنویوں کی ہیئت میں دادِ سخن دے رہے ہیں۔محمود بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔فیروز نے غزل اور مثنوی دونوں کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔محمد قلی قطب شاہ کے یہاں بھی غزل ہی بنیادی درجہ رکھتی ہے۔اس دور میں فارسی زبان و لہجہ اور آہنگ اسلوب کا ظہور فیروز کی غزل میں ہو رہا ہے جب فیروز اپنی غزل میں یہ اسلوب اور لہجہ پیدا کرتا ہے تو وہ غزل کی اس روایت کی طرف

قدم بڑھاتا ہے جس کے فراز پر آج ولی کھڑے ہیں۔فیروز کہتا ہے

فیروز جے صمد کا، دیکھیں جمال صوری　　ہر حال اس صنم کار کھین خیال من میں

فیروز کی غزلوں کے مزاج میں اوزان و آہنگ اور قافیہ کے اہتمام میں ایک خاص رنگ سخن ابھرتا نظر آتا ہے۔فیروز کی غزلوں میں تصور عشق مجازی ہے لیکن اس کا رخ عشق حقیقی کی طرف بھی ہے۔ یہاں ہندوی اور فارسی اثرات ایک نئے توازن کے ساتھ گلے مل رہے ہیں، محبوب حور بھی ہے اور استری بھی، اس کے یہاں تار پیراہن، شمع انجمن سرو قدی کا بھی ذکر ہے اور سانولی سکھی اور گوری سہیلی کا بھی۔اس دور کے استاد شاعر محمود کا بیشتر کلام غزلوں پر مشتمل ہے وہ بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔اور غزل کی حیثیت کو پورے طور پر استعمال میں لاتا ہے۔اس کے یہاں ہر غزل میں مطلع اور مقطع ملتا ہے۔ ہر غزل میں کم از کم پانچ اشعار ضرور ہوتے ہیں۔ یہاں اشعار کی تعداد ایک ہی بحر ردیف و قافیہ میں زیادہ ہے۔اس کے یہاں فارسی تراکیب اور بندشوں سے شعر میں ایک خوبصورت آہنگ کا احساس ہوتا ہے اور اس میں روانی شیرینی اور برجستگی بڑھ جاتی ہے۔جیسے چراغ بے بہا، رسم آمیز عالم، نقشِ چپ و راست، بیتابی عشاق، شعور جرس، کمند عقل محمود کے یہاں موضوعات غزل میں بھی تبدیلی آئی ہے۔وہ غزل کو صرف عورتوں سے باتیں کرنے یا عشقیہ جذبات کے اظہار کے لئے استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے اسکا ایک شعر ملاحظہ ہو

ڈرتا ہوں میں اس مست سیہ چشم سوں آخر
بے دیں کریں محمود سے سجادہ نشیں کوں

محمد قلی قطب شاہ کی غزل پر حافظ شیرازی کی شاعری کا واضح اثر ہے۔انوری خاقانی، نظامی، عنصری اور ظہیر فاریابی کے نام بھی اس کی شاعری میں آتے ہیں، محمود، فیروز جو

بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے ان کے تتبع میں وہ غزل کو بنیادی صنف کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو نمونہ کلام۔

نبی صدقے قطب کو ندیا چن اچھے ثریا سے
فلک پر یو غزل سن سن کے ہوئے مشتری بے ہوش

عبداللہ قطب شاہ کی بہت سی غزلوں میں صنعت لزوم مالا یلزم کا استعمال کیا گیا ہے اور ہر مصرعہ میں ہم قافیہ الفاظ کے ساتھ ایک لے ایک جھنکار پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے

یو عید ہمن ساجے نصرت کے بجیں باجے
ہے جگ کے نبی راجے دن دین محمدؐ کا

ابوالحسن تانا شاہ کے یہاں بھی فارسی ترکیب پائی جاتی ہے۔ اس دور میں ایک قابل ذکر بات یہ ہیکہ ادب کی طویل روایت اور شمال کے گہرے اثرات کی وجہ سے زبان و بیان میں صفائی و روانی پیدا ہوگئی ہے اور زبان کے نئے معیار کے خدوخال صاف نظر آتے ہیں یہ خصوصیت ابوالحسن تانا شاہ کے کلام میں ملتی ہے۔ فارسی ترکیب اور بندشوں میں ایسے تیور نظر آنے لگے ہیں جو آگے چل کر ریختہ کا معیار بنتے ہیں۔

ابوالحسن تانا شاہ کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جوں گل شگفتہ ہو کر مری انجمن میں آ

اس دور کے دو شاعر ذوقی اور بحری بھی ہیں۔ اس دور میں غزل کا موضوع اب بھی محبوب ہے لیکن اب ہر شاعر پامال مضامین سے بچ کر اپنا الگ راستہ بنانے کی فکر کر رہا ہے۔

اس دور کی غزل میں فنی شعور زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ ذوقی کی غزلیں اس رجحان کی ترجمانی کرتی ہیں بحری کی غزلوں میں جو چیز ہمیں متاثر کرتی ہے وہ ان کا راگ ہے وہ عشق کو طرح طرح بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن عشق تو حدّ اظہار سے پرے ہے۔ بحری کی زبان بنیادی طور پر دکنی ہے لیکن اس پر نئی زبان کے معیار کا رنگ بھی گہرا ہے۔ بحری کی غزلیں اسی روایت کی ترجمانی کررہی ہیں جس پر شروع میں ولی چلے تھے اگر بحری کی غزلوں کو ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں ملا دیا جائے تو پہچاننا مشکل ہوگا۔ ولی تک آتے آتے اردو شاعری کی روایت تین سو سال سے بھی زیادہ پرانی ہو چکی ہے۔ ولی کی شخصیت میں شمال و جنوب کی تہذیبوں کا امتزاج عمل میں آیا اور زبان و بیان کے اس نئے معیار کا آغاز ہوا جسے برسوں تک ریختہ کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے اور جس کی ممتاز ترین نمائندہ صنف غزل ہے۔ ولی غزل اور ریختہ کی اس ایجاد میں سبھوں کا مبدا اور استاد ہے۔ ولی سے پہلے غزل میں کسی گہرے تجربے کا احساس یا حیات و کائنات کے شعور کا پتہ نہیں چلتا۔ شاہی، نصرتی، ہاشمی، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، عبداللہ اور غواصی کا پورا کلام اس تصور سے خالی ہے۔ ولی کا کمال یہ ہے کہ اس نے قدیم روایت میں زندگی کے رنگارنگ تجربات، تنوع اور داخلیت کو سمو کر غزل کے دائرہ کو پوری زندگی پر پھیلا دیا۔ ولی نے شمال اور جنوب کی زبان کو ملا کر ایک ایسا ادبی روپ دیا جو بیک وقت دونوں کے لئے قابل قبول تھا۔ اظہار کے اس ادب نے اردو کو فارسی کی جگہ بٹھا دیا۔ ولی نے تمام زمینوں میں غزلیں کہیں جن میں قدیم شعرائے دکن محمود، فیرو، زخیالی، حسن، شوقی، محمد قطب قلی شاہ، نصرتی اور شاہی وغیرہ نے دادِ سخن دی تھی۔ ولی کی آواز ان سب آوازوں سے مل رہی ہے اور ان سے الگ بھی ہے، ولی محبوب کا سراپا بیان کررہا ہے تو اس میں خارجیت کے ساتھ داخلیت بھی شامل ہوگئی ہے۔ غزل کی یہ روایت جو آئندہ دور میں اپنے عروج کو پہنچی اس کا سرچشمہ ولی کی غزل

ہے، جتنے مضامین اردو غزل سے وابستہ ہیں وہ سب ولی کے یہاں ملتے ہیں، نمونہ ملاحظہ ہو

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی پجن ہاری اس بت کو پجاتی جا
تجھ عشق میں جل جل جل کر سب تن کو کیا کاجل — یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کو لگاتی جا

اس کے بعد فراقی اور داؤد نے ولی کی غزل کی روایت کو آگے بڑھایا لیکن ولی کے بعد اور دور میر و سودا سے پہلے کے درمیانی عرصہ میں سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی ۱۱۲۸۔۱۱۷۷ھ/۱۷۱۵۔۱۷۶۳ء سب سے بڑے شاعر ہیں جن کی پرگوئی جوش طبع اور رنگ سخن کو کوئی دوسرا نہیں پہنچا۔ سراج کا محبوب ایک زندہ جیتا جاگتا اور گوشت پوشت کا انسان ہے، جس کے عشق میں وہ جل رہے ہیں۔ ساری دکنی غزل میں شاعر براہ راست محبوب سے باتیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پوری اردو شاعری کے پس منظر میں سراج کی شاعری کو رکھ کر دیکھا جائے تو وہ اردو شاعری اور غزل گوئی کے راستہ پر ایک ایسی مرکزی جگہ کھڑے ہیں جہاں سے میر، درد، مصحفی، آتش، مومن، غالب اور اقبال کی راویت کے راستے صاف نظر آتے ہیں۔ سراج اورنگ آبادی کے بعد شاہ قاسم علی قاسم جن کا انتقال بارہویں صدی ہجری کے آخر میں ہوا ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کے زمانہ میں دکن میں غزل اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ اب سراج اورنگ آبادی کی ایک غزل پر غزل در دکن کی کہانی ختم ہوتی ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا — کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تونہی دھری رہی
کیا خاک آتش عشق نے دل بے نوائے سراج کو — نہ خطر رہا نہ حزر رہا مگر ایک بے خطری رہی

مقدس کتابوں کی روشنی میں: خواتین کے ساتھ سلوک

(تاریخ نشر ۲۰/مارچ ۱۹۹۸)

آج کے ترقی یافتہ دور میں مغربی دنیا نے عورتوں کے حقوق اور مرد و عورت کے درمیان صنفی مساوات کے نظریہ کو اس قدر عام کیا اور اس نظریہ کی بنیاد پر عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بہ شانہ لا کھڑا کرنے کی اپنی غیر فطری اور بے بنیاد مہم کو میڈیا کے ذریعے اس طرح پھیلایا کہ ایک عام انسان جس کی نظر مذاہب عالم اور اسلام کے متوازن اور معتدل قوانین پر نہ ہو تھوڑی دیر کے لئے یہ بات باور کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مذاہب عالم میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے مغرب کے نعرہ مساوات مرد و زن سے پوری دنیا میں ایک شدید غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور یہ غلط فہمی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ خواتین سے متعلق مذاہب عالم اور ان کی مقدس کتابوں کی روشنی میں ان کے حقوق کا گہرائی سے مطالعہ نہ کیا جائے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے عورتوں کے مقام بلند کے بارے میں :۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔انجیل میں خاتون کو بحیثیت ماں اور بحیثیت بیوی بہت اونچا مقام دیا گیا ہے۔

انجیل متّی کے بیان کے مطابق ایک شخص نے پاس آ کر حضرت عیسیٰ سے کہا اے استاد میں کونسی نیکی کروں تا کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں، اس نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیکی تو ایک ہی ہے لیکن اگر تو زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو حکموں پر عمل کر، اس نے اس سے کہا کون سے حکموں پر یسوع نے کہا یہ کہ خون نہ کر، زنا نہ کر، چوری نہ کر، جھوٹی گواہی نہ دے اپنے باپ اور ماں کی عزت کر اور اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ (۱۷۔۱۹۔۲۰)۔

بیوی کی حیثیت سے بھی انجیل نے عورت کو بلند مقام عطا کیا ہے۔متّی کا بیان ملاحظہ ہو:

''اور فریسی اسے آزمانے کو اس کے پاس آئے اور کہنے لگے کیا ہر ایک سبب سے اپنی بیوی کو چھوڑ دینا روا ہے۔اس نے جواب میں کہا کیا تم نے نہیں پڑھا کہ جس نے انہیں بنایا اس نے ابتدا ہی سے انہیں مرد اور عورت بنا کر کہا کہ اس سبب سے مرد باپ سے اور ماں سے جدا ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ رہے گا اور وہ دونوں ایک جسم ہونگے پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں اس لئے جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے انہوں نے اس سے کہا پھر موسیٰ نے کیوں حکم دیا ہے کہ طلاق نامہ دے کر چھوڑ دی جائے اس نے ان سے کہا کہ موسیٰ نے تمہاری سخت دلی کے سبب سے تم کو اپنی بیویوں کو چھوڑ دینے کی اجازت دی مگر ابتداء سے ایسا نہ تھا اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرامکاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی سے بیاہ کر لے وہ بھی زنا کرتا ہے۔ (۱۹۔۳۔۱۰)۔

ہندو مذہب میں بھی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم ملتی ہے اور ان کی عصمت کی حفاظت کو مذہبی تعلیمات میں اہم جگہ دی گئی ہے۔ بحیثیت لڑکی اس کی تعلیم اور نگہداشت بحیثیت بیوی محبت و وارفتگی، حقوق کی ادائیگی اور بحیثیت ماں اس کی خدمت اور راحت وآرام کا خیال ہندو مذہب کی تعلیمات کا ایک اہم عنصر ہے۔

بدھ مذہب میں جو آٹھ اصول مقرر کئے گئے ہیں ان سے بھی عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک پر روشنی پڑھتی ہے۔وہ آٹھ اصول یہ ہیں: سچا جذبہ، سچا برتاؤ، سچی نظر، سچی کوشش، سچی زبان، سچی خدمت، سچے خیالات اور سچا علم۔ مہاتما گوتم بدھ کی تعلیم یہ تھی کہ آدمی کو اگر نروان حاصل کرنا ہے تو اسے من کرم اور زبان سے سداچاری ہونا چاہیئے۔

جین دھرم میں انسانوں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے کیونکہ اس دھرم کے مطابق کسی جاندار اور ذی روح کو ستانا بہت بڑا اگناہ ہے، جین دھرم کے پانچ اصول ہیں: ہمیشہ سچ بولو، لالچ مت کرو، چوری مت کرو، کسی ذی روح کی مت ستاؤ، اپنی خواہشات کو مار کر زندگی گذارو۔

سکھ مذہب میں عام لوگوں کی خدمت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے تو اس سے خود بخود بات ثابت ہوتی ہے کہ عورتوں کا مقام ان کے یہاں بہت بلند ہے سکھ مذہب کے جو نو اصول ہیں ان سے ہمارے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے وہ اصول یہ ہیں: سچائی خدا ہے، سچائی آدمی کو مایا کے بندھنوں سے آزادی دلا سکتی ہے۔ اتفاق بڑی طاقت ہے، سب کو ایک نظر سے دیکھا جائے، زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لوگوں کی خدمت کرنا چاہئے، گرو کی سیوا سے خدا ملتا ہے، بیڑی، سگریٹ، شراب پینا یا کوئی نشہ کرنا ذلت کی بات ہے۔اس دن سے ڈرتا رہ جب خدا تیرا انصاف کرے گا، گناہ گار وہ ہیں جنہوں نے حدود الٰہی کو توڑا۔

اسلام میں عورتوں کا مقام بہت اونچا ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی میری جانب سے نصیحت قبول کرو''۔دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا ''دنیا کی چیزوں میں سے خوشبو اور عورتوں کی محبت میرے دل میں ڈال دی گئی ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔اسلام میں عورتوں کے ساتھ ان کی فطرت کے مطابق پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔عورتوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ عورتیں فطری طور پر نازک ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے مخصوص مصالح کے تحت انہیں بالارادہ ایسا ہی بنایا ہے اس لئے ہمیشہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہئے کوئی بھی بات ایسی نہ ہو جس کا تحمل اسکی شخصیت نہ کرسکے۔اسی حقیقت کا اظہار حضور ﷺ نے اس طرح فرمایا ''عورت پسلی کی مانند ہے اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو سیدھا تو نہ کرسکو گے البتہ اسے توڑ ضرور دو گے''۔

اسلام میں نماز کی جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی تفصیل کی محتاج نہیں لیکن اس مقام پر بھی شریعت نے عورتوں کے جذبات کی اسقدر رعایت کی ہیکہ انسان ششدر رہ جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں اور چاہتا ہوں کی نماز لمبی پڑھوں لیکن اسی درمیان کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کردیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ میرا نماز کو طول دینا اس کی ماں کو تکلیف دینے کا سبب بنے گا۔

عورت جنس فرومایہ نہیں بلکہ وہ ایسی متاع گرانمایہ ہے جو گلکدہ حیات میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اسی کے ساز سے زندگی کا سوز دروں ہے۔فرمایا جناب رسول خدا ﷺ نے ''پوری دنیا ایک پونجی ہے اور دنیا کی اس پونجی میں سب سے بہتر پونجی نیک اور پاکباز عورت ہے''۔

عورت کا ایک مقام ایسا بھی ہے جس میں مرد بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتا اور نہ اس کی عظمت تک کسی مرد کی رسائی ممکن ہے۔یہ وہ مقام ہے جس کو ایک اچھوتی اور چھوٹی حدیث میں حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے آپ نے فرمایا ''ماں کے قدموں تلے جنت ہے''۔

ایک بار حضور اکرم ﷺ سفر فرمارہے تھے۔سفر میں کچھ خواتین بھی اونٹ پر سوار ہو کر منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔سفر کی منزلوں کو جلد طئے کرنے اور منزل مقصود کو پا بہ جولاں کرنے کے جوش میں ساربان نے اونٹ کو تیز چلانا شروع کیا تو حضور ﷺ نے ساربان سے فرمایا کہ اونٹ کو تیز نہ چلاؤ اس سے اونٹ پر سوار خواتین کو تکلیف پہنچے گی۔اس موقع پر آپ ﷺ نے عورتوں کے لئے لفظ ''نساء'' استعمال نہیں فرمایا جو عموماً عربی میں عورتوں کے استعمال ہوتا ہے بلکہ لفظ ''قواریر'' استعمال فرمایا جو عربی زبان میں آبگینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ''اے انجشہ (حضرت انجشہ ساربان تھے) ذرا آہستہ آہستہ کہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو، اس موقع پر قواریر کا استعمال جہاں ایک طرف کلام نبوی کی بلاغت پر دلالت کررہا ہے وہیں اس بات پر بھی شاہد عدل ہیکہ عورت اسلام کی نگاہ میں کتنی باعظمت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کتنی نازک ہے یہ کارشیشہ و آہن ہے۔

ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میں نے اپنی ماں کا بدلہ چکا دیا آپ نے پوچھا کیا بدلہ دیا، انہوں نے عرض کیا کہ میں نے انہیں اپنے کاندھے پر سوار کر کے حج کرایا ہے۔حضور نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا اب بھی تم نے ماں کا حق ادا نہیں کیا ماں کے صدمہ ولادت کے ایک لمحہ کا حق بھی نہیں۔

لڑکی کے ساتھ اسلام میں حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا'' جس شخص کے گھر میں بچی پیدا ہو تو وہ نہ تو اس کو مار ڈالے (اسقاط حمل بھی اس ضمن

میں آتا ہے) نہ اس کی اہانت کرے اور نہ اولاد نرینہ کو اس پر ترجیح دے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل فرمائینگے۔" دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا "جس شخص کو اللہ نے دو لڑکیاں دی ہوں یا تین لڑکیاں دی ہوں اور اس نے ان کی پرورش کی، ان کی تعلیم وتربیت کی اور ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کیا تو ایسا شخص جنتی ہے۔"

عورت بحیثیت بہن بھی شریعت کی نگاہ میں قابل عظمت ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا "اگر کسی شخص کو تین بہنیں ہوں اور وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو ایسا شخص جنت میں داخل ہوگا۔ کتنا اونچا مقام ہے، بہن کے ساتھ حسن سلوک کا وہ بہنیں اسکو جنت میں داخل کرانے کا ذریعہ بنیں گی۔

عورت طلاق یا شوہر کی وفات کی صورت میں بھی حسن سلوک کی مستحق ہے۔ حضور ﷺ نے سراقہ بن جشعم سے فرمایا کہ کیا میں تم کو عظیم ترین کار خیر کی طرف رہنمائی نہ کروں، انہوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ضرور اس کی نشاندہی فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا "تم اپنی اس لڑکی کی نگہداشت کرو، اس کے اخراجات برداشت کرو جو طلاق یا شوہر کی وفات کے سبب تمہارے پاس واپس آگئی ہے اور اس کے لئے اب تمہارے علاوہ کوئی اور سہارا نہیں ہے۔"

آج مغربی تہذیب نے عورتوں کو کس مقام پر لا کر کھڑا کیا ہے اس کا کچھ اندازہ ان ممالک میں بوڑھوں اور بوڑھیوں کے لئے بنے ہوئے ہاسٹلس سے لگایا جاسکتا ہے جہاں وہ حسن سلوک کی آرزوؤں تک سے محروم ہیں اور جن عورتوں کے بدن میں جوانی کا خون دوڑ رہا ہے مخصوص ماحول میں تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں نہ حسن سلوک ان کا منتظر اور نہ وہ حسن سلوک کے منتظر۔ مذہبی تعلیمات ہی اس خلا کو پر کرسکتی ہیں، اس درد کا درماں نہ مشرق کے پاس ہے اور نہ مغرب کے پاس اگر ہے تو صرف مقدس کتابوں کے اوراق میں، لیکن کیا ہمیں ورق گردانی کی فرصت ہے؟

فلک پر بھی پہنچی صدائے محمد ﷺ

(تاریخ نشر ۱۶؍ نومبر ۱۹۹۸)

زندگی آزمائشوں کی آماجگاہ ہوتی ہے اور ہر شخص کے حصہ میں اس کی ہمت و عزیمت اور پامردی و ثبات قدمی کے بقدر آتی ہے۔ تاریخ کے زریں صفحات پر اس راہ کے دیوانوں، ان کے کارناموں اور تاریخ انسانیت پر ان کے دوررس اثرات اور انمٹ نقوش ثبت ہیں اس وقت دنیا میں خیر وشر اور صلاح وفساد کا جو تصور پایا جاتا ہے ان ہی قدسی نفوس اللہ کے برگزیدہ بندوں کی جگر کاوی آہ سحر گاہی نالہ نیم شبی یقین محکم عمل پیہم بلند نگہی اور زہرہ گدازی کا صدقہ ہے۔

ستودہ صفات اور منصب نبوت کے عالی مقام حاملین کے سلسلہ طلائی کی آخری کڑی دعائے خلیل اور نوید مسیحا آج سے پندرہ سو سال پہلے پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئی اور حراء کے غار سے اس کے منصب نبوت کی گرانباریوں کا آغاز ہوا اور ساڑھے تین سو سال سے سرزمین عرب میں پھیلی بت پرستی شرک اور خدا بیزاری کے ماحول میں بنی نوع انسانی کے سب سے بڑے اور سب سے آخری گلہ بان کو حکم دیا گیا کہ وہ خدا کی وحدانیت اور اسی میں فلاح کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے واشگاف کریں اور پھر صفا کی پہاڑی سے اعلان کرنے والے نے اسی حقیقت سرمدی کا اعلان کیا جس کی گواہی حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک دیتے آئے تھے لیکن خاندانی عصبیت اور کبر ونخوت قلبی شہادت کے باوجود زبانی شہادت و اقرار کی راہ میں حائل رہی۔ جس کے صدق پر اور جس کی امانت پر پورا عرب متفق تھا خدا کے بارے میں اس صادق کی صداقت اور اس امین کی امانت مشکوک سمجھی گئی لیکن جاہلی عصبیت کے

علمبردار کی زبان سے انکار کی حقیقت اور اس کی بنیاد آشکارا ہو ہی گئی۔ ابوجہل کا تاریخی اقرار قیامت تک کے مسلمانوں کیلئے مشعل راہ ہے اس حقیقت کے مشاہدہ کے لئے کہ انکار برائے انکار ہر زمانہ میں کفر وشرک کی خمیر کا جزو لاینفک رہے گا۔ ابوجہل نے کہا ''ہم میں اور بنی عبد مناف میں مقابلہ ہوا انہوں نے کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا۔ انہوں نے سوار کرایا تو ہم نے بھی سوار کرایا۔ انہوں نے دیا تو ہم نے بھی دیا۔ پھر جب ہم نے ان کے کندھے سے کندھا ملایا اور گھوڑ دوڑ کے میدان کے دو برابر گھوڑوں کے مانند ہو گئے تو عبد مناف والے کہتے ہیں کہ ہم میں ایک نبی ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے۔ بھلا ہم ایسا کہاں سے پائیں، خدا کی قسم ہم ان کو نہیں مان سکتے۔ ہم ان کی تصدیق نہیں کر سکتے''۔

پھر آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہوا پہلے زبان بندی کی کوشش کی گئی اور جب زر، زن، زمین کی پیش کش اس کی بارگاہ میں ناقابل التفات ٹھہری تو لے دے کر ہر طرح زبان بندی کی سعی لاحاصل کی گئی۔ رسیوں میں باندھ کر مکہ کی گلیوں میں اس کے جان نثاروں کو بری طرح گھسیٹا گیا۔ آگ کے شعلوں اور گرم پتھروں پر لٹایا گیا۔ ان کے جسم کو خنجر و پیکاں کا تختہ مشق بنایا گیا۔ سمندر پار حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کیا گیا شمع رسالت کے پروانوں پر ظلم و بربریت کے ہر نسخہ کو آزمایا گیا۔ ترکش انتقام کے ہر تیر کا ان کو نشانہ بنایا گیا دوسری طرف شرک و کفر کے نشہ میں سرشار عقل کے دشمنوں نے اپنے خیر خواہ کی راہ میں کانٹے بچھائے۔ گردن مبارک میں پھندا لگایا گیا اسی پر بس نہیں بلکہ چہرہ انور پر تھوکا گیا۔ سر پر خاک ڈالی گئی نماز کی حالت میں پشت مبارک پر لید سے بھری اوجھ رکھی گئی اور شادی شدہ بیٹیوں کو طلاق دلائی گئی۔ حضرت زینب کو اونٹ سے گرایا گیا۔ حضرت عائشہ پر تہمت باندھی گئی لیکن زبان بندی کی یہ ساری ترکیبیں نقش برآب ثابت ہوئیں بلکہ اس کی خوش نوائی اور بلند الحانی میں اضافہ کا سبب

بنیں۔ پھر ابوطالب کو اس بات پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ اپنے بھتیجے کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ چنانچہ چچا نے بھتیجے سے باچشم نم یہ کہا کہ ''مجھ پر اتنا بوجھ نہ لادو جسے میں نہ اٹھا سکوں'' خوشی کے شادیانے بجنے لگے کہ آخر تیر ٹھکانے پر لگا لیکن اسی لمحہ ان کے کانوں تک یہ آواز بھی پہنچی کہ خدا کی قسم اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند اس لئے رکھ دیا جائے کہ میں اس کام سے دستبردار ہو جاؤں تو یہ ناممکن ہے۔ یہ کام پورا ہوگا یا میں اس راہ میں مر جاؤں گا'' یہ کوشش بھی ناکام ہوئی تو پورے تین سال تک ابوطالب کی گھاٹی میں ان پر کھانا بند کیا گیا۔ پانی بند کیا گیا۔ بچے بلبلا رہے ہیں اور مائیں صبر وشکر کی آغوش میں تغافل کیشوں کے تغافل کا مردانہ وار مقابلہ کر رہی ہیں جن کے دانتوں نے شاید سوکھا گوشت بھی نہ چبایا تھا ان کو خشک چمڑے پر اکتفا کرنا پڑا۔

جانوروں کے چارے پر رہروان جادہ حق کو ہفتوں بسر کرنا پڑا اس سے نجات ملی تو ڈھارس باندھنے والے چچا اور غم واندوہ کے عالم میں تسلی دینے والی بیوی دونوں یکے بعد دیگرے اس داعی بے نوا کو اس کڑی امتحان گاہ میں چھوڑ کر چل بسے، یہ سوچ کر کہ شاید طائف والے کچھ سنیں آپ کے دل میں طائف کے دعوتی سفر کا خیال پیدا ہوا۔ زید بن حارثہ کو ساتھ لیا اور پیادہ پا نکل پڑے۔ بے مائگی کا یہ عالم کہ نہ کوئی سواری ہے اور نہ کرایہ کی سواری کے لئے پیسے۔ لیکن نشہ توحید کے متوالے اسباب و ذرائع کی نارسائی کا گلہ نہیں کرتے بلکہ نارسائی کی کلفت ان کے تار دل کے لئے زخمہ زن ثابت ہوتی ہے اور ان کے اس اسپند ہمت کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے طائف میں عالم لاہوت کی آواز سن کر عالم ناسوت کے ایک فرد کی زبان سے نکلا جسے سفر کیلئے گدھی بھی میسر نہیں خدا کو اس کے سوا رسول بنانے کے لئے اور کوئی نہیں ملا تھا۔ ابھی اس کی صدائے بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک دوسری آواز کانوں سے ٹکرا رہی تھی

غلاف کعبہ تار تار ہو جائے اگر خدا نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تیسری طرف سے آواز آئی تم اگر رسول ہو تو میں اس کا مستحق نہیں کہ تم سے گفتگو کروں اور اگر تم رسول نہیں ہو تو یہ میرے لئے ذلت کی بات ہے کہ کسی جھوٹے سے بات کروں۔ نیم کش تیر کی بوچھار سے بھی ظالموں کے دل کی پیاس نہ بجھی سنگباروں نے سنگباری شروع کی جسم لہولہان ہو گیا۔ نوعمر رفیق سفر نے سہارا دیا لیکن طائف سے باہر قرن الثعلب کے موڑ تک پہنچتے پہنچتے پیر میں چلنے کی سکت باقی نہ رہی لیکن وہ زبان جواب تک بند تھی وا ہو گئی۔ دل کا طوفان جواب تک تھما ہوا تھا تھمنے کا نام نہ لیتا تھا صبر وشکیب کی چٹان پھوٹی اور عجز و نیاز کا سر چشمہ ابلنے لگا۔ وہ عجیب سماں تھا جب پردیس میں ایک پردیسی داعی اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اپنی بپتا سنا رہا تھا کس کو اسی کو جو بے سہاروں کا آخری سہارا ہے وہ کچھ یوں کہہ رہا تھا: اے اللہ میرے، میرے اللہ اور کس کو اپنی بے کسی اور بے بسی کی کہانی سناؤں اور کس کے سامنے اپنی بے مائیگی کا دکھڑا رکھوں۔ ذرا دیکھ تو سہی میری کیسی بے عزتی اور بے وقعتی ہو رہی ہے اے دکھیاروں کے آسرے اور بے نواؤں کے سہارے تو نے مجھے کس کے سپرد کر دیا ہے، کیا ترش رو بیگانوں کے یا تو نے میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے رکھا ہے۔ پھر بھی اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے ان کی کیا پروا، لیکن تیری ردائے عافیت ہی میرے لئے وسیع ہے میں تیرے روئے زیبا کی پناہ ڈھونڈتا ہوں جس کی تابندگی سے ظلمتیں چھٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کے کام بن جاتے ہیں۔ مجھ پر تیرا غضب ٹوٹے یا مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے اس سے پناہ مانگتا ہوں، منانا ہے اس وقت تک منانا ہے جب تک تو مان نہ جائے نہ زور ہے نہ طاقت مگر اللہ کے لئے۔

صفا کی پہاڑی سے جس آزمائش کا آغاز ہوا تھا قرن الثعلب کے موڑ پر اختتام پذیر ہوا۔ دے کر آزمایا گیا۔ لے کر آزمایا گیا۔ چھین کر آزمایا گیا۔ جھپٹ کر آزمایا گیا۔ چھان

کر آزمایا گیا۔ پھٹک کر آزمایا گیا۔ جن لوگوں نے آزمایا اگر وہ اس طرح نہ آزماتے تو آئندہ اس کی گواہی کیسے دیتے کیونکہ دنیا کے سامنے حق کی گواہی آخر ان ہی کو دینی تھی۔ اس خزاں کے بعد اسراء اور معراج کا واقعہ، بہار کا پیش خیمہ تھا جس کو دو گز زمین والوں نے گفتگو کے لائق نہ سمجھا اس کو آسمان والے نے شرف تکلم بخشا جس کو طائف تک جانے کے لئے گدھی بھی میسر نہ آئی تھی اس کی سواری کے لئے براق بھیجا گیا۔ جس کی امامت سے کفار مکہ و طائف نے انکار کیا تمام انبیائے کرام نے اس کی امامت کو کلاہ گوشہ دہقاں بہ آفتاب رسید تصور کیا جس کو اہل طائف نے گدلا پانی پیش کرنا بھی باعث ننگ و عار سمجھا اس کی ضیافت صاف وشفاف اجلے دودھ سے کی گئی۔ جس کو پست سمجھا گیا اس کو رفعت عطا کی گئی جس پر گھروں کے دروازے بند کئے گئے اس پر آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے جس کو زمین پر گالیاں دی گئیں اس کو آسمان پر انبیائے کرام نے دعائیں دیں، جس کو تنگ گھاٹی میں مقید کیا گیا اس کے لئے زمین و آسمان کی وسعتیں وا کر دی گئیں۔ قریش کے سرداروں نے جسے دھتکارا فرشتوں کے سردار نے اس کی غاشیہ برداری کی اور اس کو گلے لگایا۔

ہجرت سے ایک سال سات ماہ قبل رجب کی ستائیس تاریخ تھی آپ حطیم میں سو رہے تھے۔ حضرت جبرئیل نے آپ کو ادب سے جگایا۔ پھر آپ جسمانی طور پر بہ حالت بیداری براق پر سوار ہو کر حضرت جبرئیل کے ساتھ خانہ کعبہ سے بیت المقدس پہنچے وہاں انبیائے کرام کی امامت کی۔ براق کو بیت المقدس میں باندھا اور آسمان کی طرف حضرت جبرئیل حضور اکرم ﷺ کو لیکر چڑھے۔ پہلے آسمان پر آپ کی ملاقات حضرت آدمؑ سے، دوسرے پر حضرت یحیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے تیسرے پر حضرت یوسفؑ سے چوتھے پر حضرت ادریسؑ سے پانچویں پر حضرت ہارونؑ سے چھٹے پر حضرت موسیٰؑ سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہم

السلام سے ہوئی تمام انبیائے کرام نے آپ کوخوش آمدید کہا۔ پھر آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی۔ پھراس مقام تک پہنچے جہاں قلم قدرت کے چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی پھر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف جو چاہا وحی کیا۔ اس وقت دربار خداوندی سے آپ کو تین عطیے مرحمت ہوئے سورہ بقرہ کی آخری آیتیں جن میں ایمان وعقائد کی تکمیل اور دور مصائب کے خاتمہ کی بشارت تھی۔ امت محمدیہ کے ہراس فرد کی بخشش کا پروانہ ملا جو شرک کی آمیزش سے پاک رہا اور پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی اور تخفیف کے بعد پانچ وقت رہی۔ پھر رسول ﷺ آسمان سے بیت المقدس تشریف لائے اور ان تمام منازل کے طئے ہونے کے بعد آپ مسجد حرام میں صبح کو بیدار ہوئے۔ واقعہ معراج ایک نوید جانفزا ہے ہراس فرد کے لئے جو جادہ حق پر گامزن ہو۔ وہ ابر کرم ہے تشنہ لب داعیان حق کے لئے، وہ باد بہاری ہے خزاں رسیدہ چمنستان دعوت کے لئے، آب حیات ہے مردہ نفس جویان منزل کے لئے، نسخہ کیمیا ہے مصلحت اندیش عقل خام کے لئے اور ایک بڑا اسہارا ہے حق کی خاطر کچلے ہوئے دبائے ہوئے بختاور انسانوں کے لئے اور صلائے عام ہے قیامت تک کے انسانوں کے لئے کہ:

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

حضرت حسینؓ کی عظمت کا راز

(تاریخ نشر ۱۳ر اپریل ۲۰۰۰)

تاریخ اسلام کے صفحات پر صدہا ایسے زریں نقوش ہیں جن کی تابانی آج بھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور ان میں عبرت پذیری کے ایسے انمول نمونے موجود ہیں جو دلوں کو تپش وسوز اور آنکھوں کو اشکباری کا سامان مہیا کرتے ہیں لیکن شہادت حسینؓ کا واقعہ ایک ایسا دلدوز اور ناقابل فراموش واقعہ ہے جس میں اسوہ نبوی اور للّٰہیت وفدائیت کی راہ پر حق و صداقت کے ساتھ گامزن مردان وفا شعار کے لئے پیام ازلی اور مژدہ سرمدی ہے۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد اسلام کا مرکز ثقل دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک شام اور دوسرے عراق۔ حضرت معاویہؓ نے شام کو دارالخلافہ بنایا اور حضرت علی نے عراق کو، حضرت عثمانؓ کے قتل کا بدلہ اور حدود قائم کرنے کے مطالبہ کے نتیجہ میں جنگ جمل پیش آئی اور ۳۶ھ میں حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جنگ صفین ہوئی۔ شامیوں اور کوفیوں میں کشاکش جاری تھی کہ ۴۰ھ میں ترسٹھ سال کی عمر میں حضرت علیؓ شہید کر دیئے گئے۔ تاریخ اسلام میں اس وقت جو اندوہ ناک حالات پیش آئے ان میں فیصلہ کن بات یہ نہیں تھی کہ حضرت علیؓ غالب آجائیں اور حضرت معاویہؓ کی جگہ حکومت کریں یا حضرت معاویہؓ غالب آکر حضرت علیؓ کی جگہ لیں۔ بلکہ معاملہ وہاں اصول ونظام حکومت کا تھا کہ وہ کیا ہو۔ خلافت دینیہ یا دنیا دارانہ ملوکیت، لہٰذا فیصلہ کن بات یہ تھی کہ کون سے اصول غالب کئے جائیں۔ بادشاہی اصول یا خلافتِ نبوی کے اصول۔ حضرت معاویہ کو خود بھی اس کا دعویٰ نہ تھا کہ ان کی حکومت خلفائے ثلاثہ کی خلافت کی طرح خلافت راشدہ ہے بلکہ وہ صفائی کے ساتھ فرماتے تھے کہ وہ

ایک حاکم اور والی سلطنت ہیں البتہ انکے بعد جو حکام اور والیان سلطنت آئینگے ان کے طرز عمل کو دیکھ کر ان کی قدر آئے گی اور کھلا فرق محسوس کرینگے۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی۔ اہل عراق نے حضرت حسنؓ کا انتخاب اس نیت سے کیا تھا وہ اہل شام سے جنگ کرینگے لیکن وہ جو چاہتے تھے وہ پورا نہیں ہوا اور اس کے ذمہ دار اہل عراق خود تھے جو جنگ سے پہلو تہی کرتے رہے۔ جب حضرت حسنؓ نے دیکھا کہ ان کی فوج میں اختلاف وانتشار ہے تو آپ ان سے بیزار و مایوس ہوئے اور حضرت معاویہؓ کو خط لکھا جس میں ان کے ساتھ صلح کی تجویز رکھی اور امامت سے دستبرداری کی پیش کش کی تاکہ مسلمان خوں ریزی اور کُشت وخون سے بچ جائیں۔ چنانچہ حضرت حسنؓ ربیع الاول ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوگئے۔

حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد خلافت کے لئے حضرت حسنؓ کو نامزد کیا۔ مگر جب حضرت حسنؓ کی وفات ہوگئی تو آپ نے ۵۶ھ میں یزید کی بیعت کے لئے لوگوں کو بلایا جسے عام طور پر ناپسند کیا گیا۔ لیکن بہر حال بیعت مکمل ہوئی، اس بیعت کا سبب بتاتے ہوئے حضرت معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے اثنائے گفتگو فرمایا، میں اس سے ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد بھیڑ بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح چھوڑ دوں جو بارش میں بھیگ رہی ہو اور اس کا کوئی نگہبان نہ ہو۔

تمام ممالک میں سبھوں نے یزید کی خلافت پر بیعت کرلی سوائے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسین بن علی کے۔ حضرت حسینؓ نے یزید کی بیعت نہیں کی اور ہزار کوششوں کے باوجود آپ نے جھکنا یا نرم پڑنا

قبول نہیں کیا۔ جب یزید اور اس کے کارندوں کی طرف سے طلب بیعت میں سختی کی جانے لگی تو آپ مدینہ منورہ کے بجائے مکہ مکرمہ میں پناہ گزیں ہوگئے۔ وہاں آپ کے پاس اہل عراق کے کثرت سے خطوط آئے جن میں یہ اصرار تھا کہ آپ آکر شامیوں سے جنگ کریں ایک لاکھ افراد آپ کے ساتھ ہیں آپ نے حقیقت حال کا پتہ لگانے کی غرض سے حضرت مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا لیکن آخر کار کوفیوں نے حضرت مسلم بن عقیل کا ساتھ چھوڑ دیا اور نہایت بے رحمی کے ساتھ حضرت مسلم بن عقیل شہید کردیئے گئے۔

حضرت مسلم بن عقیل نے شہادت سے پہلے محمد بن الاشعث سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ میری طرف سے حضرت حسینؓ کو یہ پیغام دیں کہ وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ واپس چلے جائیں۔ اور اہل کوفہ کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت جابر بن عبداللہ جیسے جلیل القدر صحابہ کرام نے آپ کو سفر سے باز رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی لیکن آپ سفر پر مصر رہے۔ راستہ میں مشہور شاعر فرزدق نے کہا کہ اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں آپ کے خلاف۔ ان سب کے باوجود حضرت حسینؓ نے کوفہ کی طرف اپنا سفر جاری رکھا اور میدان کربلا میں فروکش ہوئے۔ حضرت معاویہؓ کے فرزند یزید کے فوجی کمانڈر عبیداللہ بن زیاد نے عمر بن سعد کو حضرت حسینؓ کے پاس بھیجا، تو حضرت حسینؓ نے فرمایا ''اے عمر تین باتوں میں سے ایک بات میرے لئے مان لے، یا تو مجھے چھوڑ دے تاکہ جیسے آیا ہوں واپس جاؤں۔ اگر تو اس سے انکار کرتا ہے تو مجھے یزید کے پاس لے چل، اسکے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں وہ جو پسند کرے فیصلہ کرے اور اگر یہ بھی ناپسند ہو تو ترکوں کی طرف جانے دے تاکہ میں ان سے جہاد میں جان دوں''۔ لیکن یہ پیش کش نامنظور کردی گئی۔ اب گھمسان کا رن

پڑا۔درعہ شریک تمیمی نے آپ کے شانہ مبارک پر وار کیا پھر سنان بن انس نے نیزہ چلایا اور گھوڑے سے اتر کر سر مبارک تن سے جدا کر دیا۔حضرت حسینؓ نے جس دن جام شہادت نوش فرمایا وہ یوم عاشورہ ، جمعہ کا دن ،محرم کا مہینہ ۶۱ ھ تھا اور آپ کی عمر مبارک چوّن سال ساڑھے چھ ماہ تھی ۔واقعہ کربلا میں ۷۲ افراد شہید ہوئے جس میں سترہ افراد کا تعلق بنی ہاشم اور اہل بیت سے تھا ،تمام شہدا کے سر کاٹے گئے اور عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پیش کئے گئے ۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ " حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خوں آلود حرفوں میں لکھا گیا اور اشکبار آنکھوں سے پڑھا گیا لیکن اس دردانگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعت اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اسوہ ئے حسنہ مخفی تھیں جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہا لے گئے حضرت حسینؓ کا اسوہ تاریخ دعوت وعزیمت کا ایک ایسا باب ہے جو رہروان دعوتِ حق ،اور مردان وفا کیش کو ہر آن اور ہر لحہ یہ پیغام جاں آفریں دے رہا ہے کہ حق وصداقت کی راہ ہمیشہ نتائج کی فکر سے بے پرواہ ہوتی ہے۔یہ سچ ہیکہ وہ نہ تو مریضوں کے پینے کے لئے پانی لے سکا اور نہ میدان کارزار کی فتح مندی اس کے نصیبہ میں آئی ،اس نے سرتاپا زخموں سے چور ہو کر اپنی جاں ،جاں آفریں کے سپرد کر دی لیکن فتح اسی کی تھی اور شادمانی و کامرانی کا تاج اس کے لالہ فام سر پر رکھا جا چکا تھا کیونکہ اس نے حق کی خاطر سر دینا گوارا کیا لیکن ہاتھ دینا گوارا نہ کیا اور یہی ہے حضرت حسینؓ کی عظمت کا راز۔شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

اور اسوہ حسینی کے پیام کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے اور ایسی اچھوتی تعبیر اختیار کی ہے کہ اس سے بہتر مختصر الفاظ میں تعبیر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اسوہ حسینی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین)

مقدس کتابوں کی روشنی میں : راست گوئی و راہ نمائی

(تاریخ نشر ۲رفروری ۲۰۰۱)

حیات و کائنات کے بہت سارے حقائق ہر دور میں فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار رہے ہیں، قلم کی سیاہی نے نہ جانے کتنے اوراق سیاہ کرڈالے لیکن دلائل کے انبار تلے خاکستر میں نہاں شرر کی طرح حقیقت منہ پر نقاب ڈالے طاق عقل پر جوں پڑی تھی یوں ہی پڑی رہی، وہ،کبھی عقل انسان کی طرفہ طرازیوں پر ماتم کناں ہوئی اور کبھی اس کی ژرف نگاہی، دروں بینی اوراس کی نکتہ سنجیوں پر انگشت بہ دنداں،کبھی اصولوں کے تغیرات کوثبات کے دامن میں پناہ ملی تو کبھی ثبات نے رہن رسا اورفکر بے پروا کی رزم آرائیوں میں لرزاں وترساں درآنے کی سعی لا حاصل کی ۔ان بزم ہائے رست وخیز میں انسانی آبادی اس کشتی کی طرح ورطہ حیات میں جھکولے کھاتی رہی جودریا کی تندوتیز موجوں کی آغوش میں گھر گئی ہو۔اندھیرا گھپ ہو کنارادور ہو،طوفاں بپاہواور برق وباراں اپنی جلوہ سامانیوں میں مصروف ہو۔

ایسی کٹھن منزل میں اور پریشانی کی اس مشکل گھڑی میں انسان ،اعلیٰ صفات اور اعلیٰ اخلاق کی حامل شخصیات کامنتظر ہوتا ہے تاکہ اس کودرد کادرماں اورزہر کاتریاق میسرآئے۔

اس کائنات کے خالق و مالک نے ہر زمانے میں ، ہرقوم میں ایسے برگزیدہ افراد بھیجے جنہوں نے خدائی تعلیمات کی روشنی میں اپنی بے داغ سیرت کے ذریعہ انسانیت کی راہ نمائی کا مقدس فریضہ انجام دیا۔انسان نہ خدا آگاہ تھا اور نہ خود آگاہ ، بلکہ وہ خود فراموش بھی تھا اور خدا فراموش بھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے اس کی پیدائش کی غرض کیا ہے اوراس کواس کائنات میں کیا کام انجام دینا ہے اور گود سے گور تک جو درمیانی زندگی ہے اس میں زندگی کالائحہ عمل کیا

ہو،تاکہ اس میں بہار آئے،نکھار آئے اور انسانیت کوقرار آئے۔

آج خدمت خلق (Social Sevice) اور رفاہی و فلاحی کام (Relief and Welfare Work) اور تعلیم (Education) کے مختلف میدانوں میں انسانیت کی رہنمائی کیلئے مختلف تنظیمیں اور بے شمار ادارے قائم ہو چکے ہیں جومقدور بھرانسانیت کی رہنمائی کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں اوران کوششوں اور کاوشوں کے مفید اور دیر پااثرات بھی مرتب ہورہے ہیں لیکن اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو اس مسلمہ اصول کے قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی کہ یہ سارے اصول مقدس کتابوں کے رہنما اصولوں ہی سے ماخوذ ہیں۔

اس کائنات میں جن لوگوں کواس زمین وآسمان کے مالک ۔نے خلق کی رہنمائی کے منصب عظیم پر فائز کیا وہ سب رہنمائی کے آسمان بلند پر اپنی اپنی جگہ درخشاں ستاروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔انسانیت کی رہنمائی کے سیکڑوں میدان ہیں جن میں اللہ کے نیک بندوں کی رہنمائی کے بغیر انسانیت کی کشت ویراں سرسبز نہیں ہوسکتی۔

مقدس کتابوں کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسانیت کے ان رہنماؤں نے انفرادی اوراجتماعی زندگی کے دونوں میدانوں میں زندگی گذا ۔نے کے درخشندہ اصول دیئے ان ستودہ صفات لوگوں نے انسان کوخودکشی سے،بچیوں کوزندہ درگور کرنے سے، نشہ آور چیزوں کے استعمال،شراب، جوا،زنا،قتل وغارت گری، چوری، ڈاکہ زنی، وعدہ خلافی، ذخیرہ اندوزی، حرام خوری، ناجائز کمائی، ترش روئی، بداخلاقی، بخل، عصبیت، اقرباء پروری، ظلم،سختی، حسد، کینہ،بغض وعداوت، خودغرضی، مصلحت پسندی اوران جیسے امور سے بچنے اور دور رہنے کی تاکید کی ۔حضور اکرم ﷺ نے تعلیم کی اشاعت، بیماروں کی عیادت، عوامی مفاد کی

نگرانی، پڑوسیوں کے حقوق، پس ماندہ لوگوں کی تعلیم، بڑے بوڑھوں کے احترام، پریشان حال لوگوں کی مدد، یتیموں اور بیواؤں کے تعاون، انسانیت کے احترام، ہرحال میں حسن سلوک ماحول کو آلودگی سے بچانے کی وضاحت، رفاہ عام کے سلسلہ میں شجر کاری، گھروں کی صفائی، پانی کی حفاظت، عوام کے لئے کنوؤں کی کھدائی کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس موقع پر پانی اور پانی کی حفاظت کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کی رہنمائی کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ حضرت سعد بن عبادہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے ان کے ایصال ثواب کے لئے کون سا صدقہ زیادہ افضل ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پانی سب سے افضل صدقہ ہے''۔ چنانچہ حضرت سعد نے کنواں کھدوایا اور کہا کہ یہ میری ماں کے ایصال ثواب کے لئے ہے۔ (ابوداؤد)۔ دوسری حدیث میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی تم میں سے دریا پر بھی ہو تو اسکو چاہئے کہ فضول خرچی نہ کرے۔

یجر وید کے چالیسویں ادھیائے کے پہلے منتر میں کہا گیا ہے کہ اس جگت میں جو کچھ ہے وہ سب ایشور کا ہے اس لئے تیاگ سے اپنی دولت کو تقسیم کر کے اسے استعمال کرو۔ اتھر وید میں ہے کہ تم کو ایک دوسرے کی بھلائی اس طرح کرنی چاہئے جس طرح گائے اپنے نئے پیدا ہوئے بچے کی کرتی ہے۔ بھاگوت پران میں ہیکہ اس دنیا کی سب وستوؤں اور ساری مخلوق سے اس طرح پیار کرو جس طرح ایک باپ اپنے بچوں سے پیار کرتا ہے۔ انجیل میں بھی حسن سلوک اور احترام آدم کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ جین مذہب میں اہنسا یعنی عدم تشدد کے اہم اصول کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ گوتم بدھ نے چھوت چھات سے آلودہ سماج کو اخوت و مساوات کا سبق پڑھایا۔ انہوں نے فرمایا کہ آدمی کو اگر نروان حاصل کرنا ہے تو اسے من کرم اور زبان سے سداچاری ہونا چاہئے۔ سکھ مذہب کے جو نو بنیادی اصول ہیں ان

میں اس بات کی طرف خاص طور پر رہنمائی کی گئی ہے کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے لوگوں کی خدمت کرنی چاہئے۔ وہ لوگ گنہگار ہیں جو اللہ کے مقرر کردہ حدود کو توڑتے ہیں۔ ست نامی فرقہ کے جو چند رہنما اصول ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ نہ کبھی جھوٹ بولو اور نہ کسی کی برائی کرو۔

الغرض مقدس کتابوں سے ہمیں زندگی کے ہر میدان میں رہنمائی ملتی ہے۔ لیکن صرف رہنمائی اور تعلیمات اس وقت تک بارآور نہیں ہوسکتیں جب تک کہ انسان میں اس پر سچے دل سے عمل پیرا ہونے کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ آج ضرورت ہے کہ انسانیت ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنا کر کائنات کو گل کدہ اور چمنستان میں تبدیل کر دے اس لئے کہ آج اور اس وقت اس کی جتنی شدید ضرورت ہے شاید اس سے پہلے نہ تھی۔

حضرت مریمؑ ایک عظیم خاتون

(تاریخ نشر ۸رجنوری ۲۰۰۲)

دنیا میں انسان کی عظمت، بزرگی اور بڑائی کے جانچنے کے ہر زمانہ میں الگ الگ معیار رہے ہیں اور اس معیار کے تعین میں انسانی فکر وفہم کو بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ تنظیمیں ہوں یا افراد ہر ایک نے عظمت کا ایک پیمانہ مقرر کیا اور اس پیمانہ پر جو کھرا اترا اس کے سر عظمت جڑ دی گئی۔ عجیب وغریب پیمانے مقرر کیے گئے۔ کسی نے دنیا میں سب سے زیادہ لمبی مونچھ بڑھائی تو اسکا نام گنیز بک میں آگیا۔ کسی نے گول نما کسی شیئے کو بہت زیادہ ڈنڈے رسید کیے تو شاہ سرخیوں میں اس کا نام آگیا۔ آج عظمت کے ایسے عجیب وغریب پیمانے موجود ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے انسانیت کو شرم آتی ہے۔

ان انسانی پیمانوں کے مقابلہ میں خدائی پیمانہ ہے جس کا تعلق توحید، خداترسی، انسانیت نوازی، دادرسی، جذبہ رحمت وشفقت اور تصور عفت وعصمت سے ہے۔ جو شخص بھی اس معیار پر پورا اتریگا وہ عظیم کہلائے گا۔ ایسے عظیم افراد کی ایک لمبی فہرست ہے جو اس معیار پر پورے اترے اور کائنات نے ان کی عظمت کی گواہی دی لیکن زہے قسمت ان عظیم افراد اور خاندانوں کی فہرست میں کچھ ایسے عظیم افراد اور خانوادے بھی ہیں جن کی عظمت کی شہادت کائنات ہی نے نہیں بلکہ خالق کائنات نے دی ہے ان ہی عظیم خانوادوں میں حضرت عمران اور ان کا خاندان ہے۔ عمران کے نام کی دو تاریخی شخصیتیں گذری ہیں ایک حضرت موسیٰ کے والد ماجد عمران بن بصیر اور دوسرے حضرت عمران بن ماتان حضرت مریم کے والد ماجد اور حضرت عیسیٰؑ کے جد مادری۔ حضرت عمران بن ماتان یروشلم کے ہیکل سلیمانی بیت المقدس کی

خدمت ونگہداشت پر مامور خادمانِ حرم کے سردار تھے۔ حضرت عمران کی بیوی اور حضرت مریم کی والدہ ماجدہ کا نام مسیحی نوشتوں میں حُنّہ (Haunnae) ہے جس وقت حضرت مریم رحم مادر ہی میں تھیں ان کے والد حضرت عمران کی وفات ہوگئی۔ ان حالات میں حُنہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ نذر مانی کہ اے اللہ جو بچہ میرے پیٹ میں ہے اسکو بیت المقدس کی خدمت میں وقف کرتی ہوں۔ اے اللہ میری اس نذر کو قبول فرما کیونکہ تو ہی میری دعاؤں کا سننے والا اور میرے دل کی کیفیت کا راز داں ہے۔ چونکہ یہودی قانون کے مطابق ہیکل سلیمانی کی خدمت کے لئے نرینہ اولاد کو وقف کرنے کا دستور بہت دنوں سے چلا آرہا تھا اس لئے حضرت حُنہ کو اس وقت سخت دھچکا لگا جب حضرت مریم کی پیدائش ہوئی کیونکہ اسرائیلی قانون میں لڑکی سے ہیکل سلیمانی کی خدمت کی کوئی صورت ہی نہ تھی اور حضرت حُنہ کی خواہش تھی کہ انکا لڑکا بیت المقدس کی خدمت کرے۔ اس وقت حضرت حُنّہ نے اللہ سے عرض کیا کہ اے اللہ تمنا لڑکے کی تھی اور پیدا ہوئی لڑکی اب میری نذر کیونکر پوری ہوگی۔ اے اللہ تری مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم ہے۔ میں نے اس بچی کا نام مریم رکھا ہے اور اے اللہ میں اس مریم کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

حضرت مریم کی عظمت جو پنہاں تھی اب آشکارا ہونا شروع ہوئی ہیکل کی تاریخ میں پہلی بار حضرت مریم کو تین سال کی کم عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا۔ اس تقرر پر ہیکل کے چھوٹے بڑے سب خادموں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حضرت مریم کے اس منصب عظیم پر فائز کیے جانے کے بعد ان کی پرورش وکفالت اور سرپرستی کا مسئلہ سامنے آیا اور وہ اس لئے کہ آپ کے والد ماجد حضرت عمران بن ماتان آپ کی پیدائش سے پہلے ہی اس دار فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ چونکہ حضرت مریم ہیکل سلیمانی کے رئیس الخدام کی لخت جگر تھیں

اس لئے خادمین ہیکل میں سے ہر ایک حضرت مریم کی کفالت کا دعویدار تھا اور ہر ایک اسے اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ ان خادمین میں حضرت زکریا بھی تھے اور انجیل لوقا کی صراحت کے مطابق یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریاہ ایک کاہن تھا ۔ (لوقا ۱ : ۵)۔ حضرت مریم کے والد کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں یا یہودی اصطلاح میں کاہنوں کی سرداری حضرت زکریا کے حصہ میں آئی تھی اور آپ رشتہ میں حضرت مریم کے خالو بھی تھے۔ اب فیصلہ کس طرح ہو اور کون ہیکل کے اس کم سن خادمہ کی کفالت کرے۔ آخر کار یہ طے پایا کہ اس کا فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ہو اور قرعہ کی صورت یہ طے پائی کہ نے کے قلم جو توریت لکھنے کے لئے استعمال ہوتے تھے ہر شخص ان پر توریت شریف کے کچھ کلمات لکھ کر دریائے اردن میں ڈال دے اور جس شخص کا قلم دریا کے مخالف بہاؤ کی طرف بہہ جائے اسکو حضرت مریم کی کفالت کا مستحق سمجھا جائے۔ بہر حال اس طرح قرعہ اندازی ہوئی اور قرعہ حضرت زکریا کے نام نکلا اور آپ حضرت مریم کے مربّی قرار پائے۔ ہیکل کے خادموں کی رہائش کے لئے ہیکل کے اطراف میں حجرے بنے ہوئے تھے ان میں سے ایک کمرہ بحیثیت خادمہ حضرت مریم کے حصہ میں آیا۔ خادمان ہیکل کے سردار اور مُربّی کی حیثیت سے حضرت زکریا جب بھی حضرت مریم کے پاس آتے تو ان کے پاس انواع و اقسام کے ترو تازہ میوے اور پھل پاتے۔ ان کو تعجب ہوتا اور تعجب کی وجہ یہ تھی کہ سرپرست ہونے کی حیثیت سے ان کے خورد و نوش کی ذمہ داری حضرت زکریا کے ذمہ تھی اور ان کو یہ معلوم تھا کہ انواع و اقسام کے یہ پھل میں نے مریم کو نہیں دیئے ہیں۔ آخر ایک بار حضرت زکریا نے حضرت مریم سے پوچھ ہی لیا کہ انواع و اقسام کے یہ پھل تم کو کون لا کر دیتا ہے انہوں نے جواب دیا اللہ دیتا ہے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ یہ آپ کی عظمت کی دوسری نشانی تھی اور اس عظمت

کا راز یہ تھا کہ وہ اپنے رب کی عبادت گذار اور اطاعت شعار بندی تھیں۔

حضرت مریم جو ایک عفت شعار اور خدا ترس خاتون تھیں اللہ تعالیٰ نے ان کو صدیقہ کے لقب سے نوازا اور یہ چاہا کہ ان کی ذات پر اس کی قدرت کاملہ کا ظہور ہو اور وہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا ذریعہ بنیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کو ایک ماں اور باپ کے توسط سے پیدا فرماتا ہے تو یہ بھی اس کی قدرت خلق کا ظہور ہے ورنہ ایک قطرہ میں کیا مجال کہ وہ خلاصہ کائنات انسان کو وجود بخش سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ قطرہ ایک بہانہ ہے اور وہ اصلاً اللہ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہے۔ یہ بھی اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ حضرت آدم کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا فرمایا اور یہ بھی اسی کی کرم فرمائی تھی کہ حضرت حواء کو بغیر ماں کے حضرت آدم کی پسلی سے پیدا فرمایا تو اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ حضرت حواء اور حضرت آدم کی پیدائش جب لائق استعجاب اور قابل حیرت نہیں تو پھر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش پر اظہار تعجب کیوں۔ وہ آسمان پر خدا کی قدرت کا ظہور تھا اور یہ زمین پر پس فرق صرف زمین و آسمان کا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک بار جب حضرت مریم حسب معمول ہیکل سلیمان کے مشرقی جانب گوشۂ تنہائی میں عبادت میں مشغول تھیں حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی صورت میں ان کے پاس یکایک نمودار ہوئے۔ عفت شعار حضرت مریم نے جب خلوت میں ایک انسان کو دیکھا تو گھبرا گئیں اور بول اٹھیں کہ اگر آپ خدا ترس آدمی ہیں تو میں آپ سے خدائے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں حضرت جبرئیل نے کہا میں انسان نہیں ہوں بلکہ تیرے رب کا فرستادہ فرشتہ ہوں، امین ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ آپ کو اللہ کے فرمان سے ایک ایسے پاکیزہ لڑکے کی خوشخبری دوں جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا وہ دنیا و آخرت میں معزز ہونگے اللہ کے مقرب بندوں

میں ان کا شمار ہوگا وہ لوگوں سے گہوارہ میں بھی کلام کرینگے اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، وہ صالح ہونگے ۔ یہ مژدہ جاں فزا سن کر حضرت مریم بولیں کہ میرے یہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور نہ میں بدکار اور بدچلن عورت ہوں۔ جواب ملا کہ باوجود اس کے کہ تجھے کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا ہے تیرے یہاں بچہ ہوگا اس لئے کہ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے اور یہ کام تیرے رب کے لئے بہت آسان ہے اللہ اس نومولود کو لوگوں کے لئے نشانیاں بنائے گا۔ اسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا اور وہ بچہ خدا کی رحمت کا مظہر ہوگا اس خوش خبری کے بعد حضرت مریم کو حمل قرار پا گیا۔

انجیل متّی میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے ''اب یوسع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ اس کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو ان کے اکھٹے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پا گئی۔ پس اس کے شوہر یوسف نے جو راست باز تھا اور اسے بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا اسے چپکے سے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا وہ ان باتوں کو سوچ ہی رہا تھا کہ خداوند کے فرشتے نے اسے خواب میں دکھائی دیکر کہا، اے یوسف ابن داؤد اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے اس کے بیٹا ہوگا تو اس کا نام یسوع رکھنا'' اور انجیل لوقا میں واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے ''جبرئیل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرت تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نامی سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا اور فرشتہ نے اس کے پاس اندر آ کر کہا سلام تجھ

پر جس پر فضل ہوا ہے۔ خداوند تیرے ساتھ ہے وہ اس کلام سے بہت گھرا گئی اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلام ہے فرشتہ نے اس سے کہا کہ اے مریم خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا اس کا نام یسوع رکھنا''۔

الغرض حضرت مریم کو حمل قرار پایا۔ ان ہی دنوں میں قیصر اگوسُتُس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم گورینس کے عہد میں ہوئی اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرت سے داؤد کے شہر بیت اللہ اللحم کو گیا (جو ناصرہ سے اکہتر میل کے فاصلہ پر ہے) اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا تا کہ اپنی منگیتر کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھائے جب وہ وہاں تھا تو اب ہوا کہ اسکے وضع حمل کا وقت آ پہنچا (لوقا باب ۲۔ا۔۷)۔ جب ولادت کا وقت قریب ہوا تو اللہ نے کھانے پینے کے لئے کھجور اور چشمہ جاری فرمادیا۔ وضع حمل کے وقت حضرت مریم کو اس بات کا شدید احساس ہوا کہ بغیر باپ کے بچہ پیدا ہونے کا وقت قریب ہے لوگ کیا کہینگے اس شدت احساس سے مغلوب ہوکر کہنے لگیں کہ کاش اس سے پہلے میں مرچکی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی دلائی گئی اور یہ حکم دیا گیا کہ آپ کو اگر کوئی انسان نظر آئے تو اشارہ سے یہ کہہ دیجئے کہ میں نے خدائے رحمٰن کے لئے چپ کے روزہ کی نذر مانی ہے اس لئے میں کسی انسان سے آج بات نہیں کرونگی۔ ایک شریف خاتون کے لئے جبکہ خود اس کی عصمت زیر بحث ہو زبان سے برأت اور صفائی پیش کرنے کے بجائے ''صوم سکوت'' کا خدائی نسخہ نزاکت مقام کے لحاظ سے نہایت موزوں نسخہ تھا۔ اب حضرت مریم اپنے بچہ کو گود میں لے کر اپنی قوم کے پاس آئیں۔ اب کیا تھا چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مریم تو نے بڑے غضب کی

حرکت کی، خاندان کی ناک کٹوادی، باپ کتنا شریف، ماں کتنی پاکباز اور بیٹی کے یہ کرتوت۔ اس وقت اس پاکباز مریم نے اپنے نومولود لڑکے کی طرف اشارہ کیا کہ اے لوگو اس بچے سے میری کہانی سنو۔ اللہ کی قدرت سے ناواقف انسانوں نے حضرت مریم سے کہا کہ گود کے اس بچہ سے کیا بات کی جائے۔ اس وقت اللہ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہوا اور وہ بچہ یوں گویا ہوا ! لوگو سن لو میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے اور اس نے مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں بھی رہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکواۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں اور مجھے اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا ہے اور مجھے ظالم اور بدبخت نہیں بنایا ہے۔ سلام ہے مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس روز میں مرونگا اور جس روز میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤنگا۔ اس کے بعد اللہ نے فرمایا یہ ہے عیسٰی ابن مریم اور یہ ہے وہ سچی بات جس میں لوگ شک کرر ہے ہیں، اللہ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے وہ پاک ذات ہے وہ جب کسی بات کا فیصلہ کرلیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ بس ہو جاتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی پس تم اس کی بندگی کرو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔

آج جبکہ دنیا میں عفت اور پاکدامنی کا تصور بہت کچھ اپنی معنویت کھو چکا ہے ضرورت ہے کہ حضرت مریم جیسی عفت شعار برگزیدہ خاتون کی شخصیت اور کردار کو ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عام کیا جائے تا کہ پاکدامنی اور عصمت کو اس کا صحیح مقام ملے اور حضرت مریم جیسی باکردار خواتین کے ذریعہ ایک اچھا معاشرہ وجود میں آئے جس کی آج کے حالات کے تناظر میں سخت ضرورت ہے۔

مقدس کتابوں کی روشنی میں : معاشرتی اخلاق

(تاریخ نشر ۱۹ر جولائی ۲۰۰۲)

روئے زمین کے کسی خطہ پر جب انسانی آبادی پائی جاتی ہے تو ان آباد شدہ انسانوں کے وجود کو معاشرہ یا سوسائٹی کا نام دیا جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ کا یہ قافلہ جو بڑے چھوٹے، مرد عورت، پڑھنے لکھے ناخواندہ، تندرست بیمار، تاجر کاشتکار، طاقتور کمزور، جوان بوڑھے اور مختلف رنگ ونسل وزبان کے حامل افراد پر مشتمل ہوتا ہے، امداد باہمی کے اصول کے تحت زندگی کے ہر موڑ پر معاشرہ کے ہر فرد کے تئیں محبت والفت، ہمدردی وغم گساری کا جو مقدس جذبہ، احساس ذمہ داری اور شعوری احساس کے ساتھ ہر فرد کے دل میں پایا جاتا ہے اور عملی زندگی میں اس کے جو مظاہر سامنے آتے ہیں ان کو ہم معاشرتی اخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔

جو اخلاقی قدریں ایک صحت مند معاشرہ کے لئے ضروری ہیں ان کے بغیر کسی مثالی معاشرہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان انفرادی حیثیت سے دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے، لطف وخوشی کے مسرت آمیز لمحات ہوں یا حزن وملال کی غم آگیں گھڑیاں، معاشرتی اخلاق کے مظاہرہ کے بغیر معاشرہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ سوسائٹی جس کی بنیاد اخلاق پر ہو جس کا ہر فرد ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو، جس میں رنگ ونسل، زبان اور مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق نہ برتی جاتی ہو، جس میں عزت کا معیار انسان کی شرافت اور اس کی نیک نیتی ہو، جن کے آپس کے معاملات امانت داری اور رواداری کی اچھی قدروں پر قائم ہوں، جس میں ہر چھوٹا بڑے کا احترام کرتا ہو اور ہر بڑا چھوٹوں پر شفقت، وہ معاشرہ جس کا ہر فرد اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق سے آشنا ہو

وہی سوسائٹی ،معاشرتی اخلاق کے پیمانے پر کھری اترے گی اور بقائے انفع کے اصول کے مطابق روئے زمین پر باقی رہنے کی مستحق ہوگی۔

آج ہمارے معاشرتی اخلاق کے تانے بانے بکھرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ دولت پرستی، خودغرضی، انانیت، خودستائی، مکروفریب، قتل وغارت گری، فریب دہی، غیبت، حسد، تجسس اور نام ونمود کی تخیلاتی ہوس نے بےلوث ہمدردوں اور بےریا خدمت کے جذبات کو بہت حد تک بے اثر کردیا ہے۔ آج انسانی معاشرہ پر خواہشات کی حکمرانی ہے، ذرائع مقاصد بن گئے ہیں اور ساری اخلاقی تعلیمات طاق نسیان پر رکھ دی گئی ہیں اور ہر چیز اپنے صحیح مقام سے ہٹ گئی ہے جب تک بےلوث خدمت اور حقیقی اخوت ومساوات اور انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا نہ ہوگا اس وقت تک انسانی معاشرہ جہنم کدہ بنا رہے گا۔ آج ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اپنا حصہ رسدی لئے بغیر انسانی معاشرہ کی خدمت کرے۔ اپنے ہاتھ خالی رکھ کر سچے موتیوں سے انسانیت کی جھولی بھردے۔ اپنے کنبے کی طرف سے آنکھیں بند کرکے پیٹ پر پتھر باندھ کر انسانیت کو ذلت خواری کے گھڑے سے نکالے لوگوں کی تکلیفوں کو راحتوں سے اور ان کے غم کدوں کو عشرت کدوں سے تبدیل کردے۔

مختلف مذاہب کی تعلیمات اس سلسلہ میں بالکل واضح ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مخلوق، اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کی مخلوق میں بہترین شخص وہ ہے جو اللہ کے کنبہ کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کرے۔

انجیل لوقا میں ہے کہ ”لوگوں نے یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) سے پوچھا پھر ہم کیا کریں انہوں نے جواب میں ان سے کہا جس کے پاس دو کرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے۔

رگ وید میں ہے کہ جو اپنی کمائی کو اکیلا ہی کھا جاتا ہے وہ گناہ کھاتا ہے۔ جو غریبوں اور حاجت مندوں کی مدد کے لئے خیرات کرتا ہے وہی سخی ہے اس کا بھلا ہوتا ہے، اس کے دشمن بھی اس کے دوست بن جاتے ہیں اور جو ترس کے قابل یتیم کو اور روٹی کے طالب کو روٹی ہوتے ہوئے بھی مدد نہیں کرتا اور سخت دل کرکے خود کھاتا رہتا ہے اس کو مصیبت آنے پر کوئی راحت نصیب نہیں ہوتی ہے“۔

بدھ مذہب میں جو آٹھ اصول مقرر کئے گئے ہیں ان میں تمام کا تعلق اخلاق کے اعلیٰ قدروں سے ہے وہ اصول یہ ہیں۔ سچا جذبہ، سچا برتاؤ، سچی نظر، سچی کوشش، سچی زبان، سچی خدمت، سچے خیالات اور سچا علم۔

جین دھرم میں بھی اخلاقیات کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ اخلاقی اصول یہ ہیں: ہمیشہ سچ بولو، لالچ مت کرو، چوری مت کرو، کسی ذی روح کو مت ستاؤ، اپنی خواہشات کو مار کر زندگی گذارو۔

سکھ مذہب میں بھی اخلاقی تعلیمات کے ضمن میں یہ بات بتائی گئی ہیکہ اتفاق بڑی دولت ہے، سب کو ایک نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کیلئے لوگوں کی خدمت کرنی چاہئے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کیلئے بھیجا گیا ہوں۔ قرآن کریم میں ہمدردی وغم گساری اور معاشرتی اخلاق کی اہمیت کو یوں اجاگر کیا گیا ہے: ماں باپ، قرابت داروں، یتیموں، فقیروں، ہمسایوں، دور کے ہمسایوں، رفیقوں، راہ کے مسافروں اور زیردستوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔ (سورہ نساء)

اسلام میں معاشرتی اخلاق کی اہمیت اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے جس میں

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہیکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے آدم کے بیٹے میں بیمار ہوا اور تو نے میری عیادت نہ کی بندہ عرض کرے گا کہ اے رب کائنات میں تیری عیادت کس طرح کرتا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان پر اپنے بھائی کے پانچ حقوق ہیں: سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، جنازہ کے ساتھ جانا، دعوت قبول کرنا اور چھینک آنے پر **یرحمکم اللہ** کہنا۔ بیمار کی عیادت، مزاج پرسی، ضروریات کی تکمیل اور رواداری کے معاملات میں اسلام نے مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں رکھی ہے اور نہ اس میں کوئی تفریق پیدا کی ہے۔

جب کوئی معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے تو گفتار کردار کی جگہ لے لیتی ہے۔ آج اخلاقیات پر بزم سخن سجانے سے زیادہ اخلاقیات سے دلِ مردہ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک انسان کے قلب وجگر سے محبت والفت، ایثار وقربانی، جذبہ ترحم، اظہارِ غم گساری و ہمدردی کا چشمہ نہ ابلے، جب تک دل کے اندر خیر خواہی اور انسانیت نوازی کا جذبہ پیدا نہ ہو اس وقت تک معاشرہ کی اصلاح ممکن نہیں ہے، محض قانون سازی معاشرتی اخلاق پیدا نہیں کرسکتی، اس کی صرف ایک ہی سبیل ہے اور وہ یہ کہ انسان کے اندر حقیقی انسانیت پیدا ہو اور ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر تن، من، دھن کی بازی لگادے۔

معاشرتی اخلاق کی ہر زمانہ میں ضرورت رہی ہے کیونکہ وہی مرض کی دوا اور زہر کا تریاق ہے۔ آج جبکہ اخلاقی قدریں موت وزیست کی کش مکش سے دوچار ہیں ضرورت ہے کہ شمع اخلاق کی لو تیز ہی نہیں بلکہ تیز تر کی جائے تاکہ معاشرہ کوئی روشنی، تابانی اور استحکام نصیب ہو اور پرسکون معاشرہ میں ہر فرد چین کی زندگی گذارے۔

کربلا آج بھی درس عمل دیتی ہے

(تاریخ نشر ۲/ مارچ ۲۰۰۴)

دنیا واقعات کی آماجگاہ ہے، روزانہ زمین کی پشت پر ہزاروں واقعات رونما ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی عبرت پذیری اور اثر آفرینی کھو دیتے ہیں لیکن سرزمین کربلا پر شہادت حسینؓ کا جو دل دوز، جان کاہ اور دردناک واقعہ رونما ہوا وہ آج بھی زندہ، تابندہ اور پائندہ ہے۔ انہوں نے جو درخشاں اسوہ چھوڑا ہے اس میں للّٰہیت وفدائیت کی راہ پر گامزن مردانِ وفاکش کے لئے ایسا پیغام سرمدی اور مژدہ جانفزا ہے جس پر کبھی کہنگی اور پژمردگی طاری نہیں ہوسکتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلی سے جا ملے اس حال میں کہ آپ نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا اور جماعۃ المسلمین نے صلاح ومشورہ کے ذریعہ بہ اتفاق آراء حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ پھر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے عراق کو اور حضرت معاویہؓ نے شام کو دارالخلافہ بنایا۔ حالات دھماکہ خیز تھے ہر طرف افواہوں کا بازار گرم تھا۔ حضرت عثمانؓ نہایت بے بسی کی حالت میں شہید کردیئے گئے تھے، اس لئے حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کا مطالبہ طول پکڑ گیا غلط فہمیاں بڑھتی گئیں اور نتیجہ میں جنگ جمل اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ۳۶ھ میں جنگ صفین پیش آئی۔ مسلمان ایک نازک ترین دور سے گذر رہے تھے۔ کشت وخون کا بازار گرم تھا اور جنگ صفین کے صرف چار سال بعد سن ۴۰ھ میں حضرت علی کی شہادت کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا اس وقت آپ کی عمر مبارک ترسٹھ سال تھی۔

اس جان گسل اور روح فرسا واقعہ نے اہل عراق کو اس بات پر مجبور کیا کہ حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں اور ان کی قیادت وخلافت میں اہل شام سے جنگ کریں لیکن حالات وواقعات کے تجزیہ کے بعد حضرت حسنؓ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جنگ کا نتیجہ کشت وخون ریزی ہے اور ابھی تک تلواروں میں خون کی نمی باقی ہے اس لئے انہوں نے غور وفکر کے بعد حضرت معاویہؓ کو خط لکھ کر خلافت سے دست برداری کی پیشکش کی اور ربیع الاول ۴۱ھ میں حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہوگئے اور فرمایا کہ اگر خلافت ان کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا اور اگر میرا حق تھا تو میں نے ان کو اپنا یہ حق دے دیا۔ یہ سال عام الجماعۃ یعنی اتحاد واتفاق کا سال کہلایا۔

حضرت معاویہؓ اب خلیفہ المسلمین کہلائے انہوں نے اپنے بعد حضرت حسنؓ کو خلیفہ المسلمین نامزد کیا لیکن جب حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہی حضرت حسنؓ اپنے رب حقیقی سے جا ملے تو آپ نے ۵۶ھ میں اعیان سلطنت سے صلاح ومشورہ کے بعد اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا اور یزید کی بیعت کے لئے عامۃ المسلمین کو دعوت دی گئی لیکن اس کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا لیکن بہر حال جس طرح بھی ممکن ہوسکا بیعت کی تکمیل کی گئی لیکن حضرت ابوبکرؓ کے فرزند حضرت عبدالرحمٰن، حضرت عمرؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ، حضرت حضرت علیؓ کے فرزند حضرت حسینؓ اور حضرت زبیر کے فرزند حضرت عبداللہ نے یزید کی خلافت پر بیعت سے انکار کردیا۔ حضرت معاویہ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے یزید کی جانشینی کی وجہ جواز پیش کرتے ہوئے اثنائے گفتگو فرمایا ''میں اس سے ڈرتا ہوں کہ رعیت کو اپنے بعد بھیڑ بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح چھوڑ دوں جو بارش میں بھیگ رہے ہوں اور ان کا کوئی نگہبان نہ ہو۔

حضرت معاویہ اپنے رب حقیقی سے جا ملے اور یزید نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی اب حضرت حسینؓ پر بیعت کے سلسلہ میں دباؤ پڑنے لگا اور معاملہ میں شدت آنے لگی۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر حضرت حسینؓ نے مدینہ منورہ سے رخت سفر باندھا اور مکہ مکرمہ میں پناہ گزیں ہوگئے۔ حضرت حسینؓ یہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی حکومت کی روح جو خلافت میں مضمر تھی اب اس ڈگر سے ہٹ رہی ہے اور قیصر اور کسریٰ کی راہ پر گامزن ہے جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اس لئے ان کے نزدیک یزید کی بیعت خلافت اسلامیہ کی حقیقی روح کی قتل گاہ تھی۔ ان ہی حالات میں مقتل حضرت علیؓ، عراق سے آپ پر خطوط کی بارش ہونے لگی۔ ہر خط کی سرخی آپ کو آمادہ جنگ کررہی تھی اور یہ یقین دلا رہی تھی کہ ایک لاکھ عراقی سرفروش آپ کی آمد کے سراپا منتظر ہیں۔ آپ تشریف لائیں اور شامیوں سے جنگ کریں۔ حضرت مسلم ابن عقیل کو آپ نے صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ جن سرفروشوں نے مدد کی یقین دہانی کرائی تھی ان کی سرفروشی دھری کی دھری رہ گئی ان لوگوں نے کوفہ میں حضرت مسلم ابن عقیل کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا اور حضرت مسلم نہایت کسمپرسی کی حالت میں شہید کردیئے گئے۔

ان حالات میں اہل کوفہ کی بے بسی اور بے وفائی کے پیش نظر جلیل القدر صحابہ کرام نے آپ سے کوفہ کی جانب پیش قدمی سے روکنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت جابر بن عبداللہ نے اصرار کی حد تک حضرت حسینؓ کو جانب منزل مقصود پابہ رکاب ہونے سے منع کیا لیکن عزم حسینی کے سامنے ساری تدبیریں رائیگاں گئیں اور بالآخر آپ میدان کربلا میں خیمہ زن ہوئے۔ اہل کوفہ نے آپ کو بے یار ومددگار چھوڑ دیا۔ اس لمحہ ناگفتنی میں فوجی کمانڈر عبداللہ بن زیاد کا فرستادہ عمر

بن سعد جب حضرت حسینؓ کی خدمت میں پہنچا تو حضرت حسینؓ نے اس سے فرمایا ''اے عمر میں تمہارے سامنے تین باتیں پیش کرتا ہوں، ان میں سے جس بات کو تم ماننا چاہو مان لو یا تو مجھے چھوڑ دو کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہاں واپس چلا جاؤں۔ یا مجھے یزید کے پاس لے چلو تا کہ وہ میرے سلسلہ میں جو بھی فیصلہ کرنا چاہے فیصلہ کرے یا مجھے ترکوں کی طرف جانے دو تا کہ میں اللہ کی راہ میں اپنی جان دے دوں، نقارخانہ میں طوطی کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ میدان کارزار گرم ہوا۔ چند جاں نثاروں، اہل خانہ، عورتوں اور بچوں پر مشتمل یہ قافلہ مشاق، ماہر شمشیر زنوں اور تیر اندازوں کا نخچیر بنا۔ اسلام اور خلافت کے نام پر معصوم، بے گناہوں کے قتل ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان بہتر ۷۲ جاں نثارانِ اسلام کے سر تن سے جدا کئے گئے۔ شقی القلب، نا عاقبت اندیش، بد بخت کم نصیب سفان بن انیس نے جگر گوشہ رسول کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

شہادت کے وقت آپ کی عمر مبارک چون سال ساڑھے چھ ماہ تھی۔ جمعہ کا دن تھا محرم کی دس تاریخ تھی اور سن ۶۱ ھجری۔

واقعہ شہادت حسینؓ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں ''حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا اور اشکبار آنکھوں سے پڑھا گیا لیکن اس دردانگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعت اسلامیہ کی بے شمار بصیرتیں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا اور ہزاروں اسوہائے حسنہ مخفی تھیں جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہا لے گئے۔

چودہ سو سال گذرنے کے باوجود آج بھی کربلا ہمیں درس عمل دیتی ہے۔ اُسوۂ حضرت حسینؓ بہ بانگ دہل یہ اعلان کرتا ہے کہ باطل کے سامنے جھکنا حق کو سرنگوں اور نا قابل

اعتبار بنانا ہے۔ حق کی خاطر متاع عزیز جان کی قربانی بھی اگر دینی پڑے تو سودا ستا ہے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہے سوا یسا زیاں نہیں

اللہ تعالیٰ ہمیں راہ عزیمت اور جادہ حق وصداقت کے قافلہ سالار حضرت حسینؓ کے اسوہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مصنف کی مطبوعہ کتابیں

۱	خود پرستی یا خدا پرستی	اردو
۲	اورنگ زیب اور تدوین فتاوی عالمگیری	اردو
۳	اصلاحِ معاشرہ	اردو
۴	زلزلہ اسباب اور علاج	اردو
۵	اجتہاد اہمیت اور ضرورت	اردو
۶	فقہ اسلامی اور مستشرقین	اردو
۷	زکواۃ کس طرح ادا کریں	اردو
۸	والدین اور اولاد کے حقوق	اردو
۹	شریعت کا مذاق کب تک	اردو
۱۰	راہ نجات	اردو

۱۱	آئینہ تاریخ ادب عربی	اردو
۱۲	مسائل جنازہ	اردو
۱۳	تحفہ رمضان	اردو
۱۴	جمعہ فضائل، آداب، احکام، مسائل	اردو
۱۵	المستشرقون والاسلام	عربی
۱۶	الاسلام والمسلمون فی الھند	عربی
۱۷	الفرائد فی الفرائض	عربی
۱۸	المستشرقون والفقہ الاسلامی	عربی
۱۹	الامبریالیۃ الغربیۃ تھدد المسلمین	عربی
۲۰	زکوٰۃ کس طرح ادا کریں؟	ہندی
۲۱	رائٹس آف پیرنٹس اینڈ چلڈرن	انگریزی
۲۲	انشاء اور ترجمہ میں مہارت کس طرح پیدا کریں؟	اردو
۲۳	رؤیت ہلال	اردو
۲۴	ابوہریرہ الصحابی المظلوم والمفتریٰ علیہ	عربی
۲۵	اسلام میں عورتوں کے معاشی حقوق	اردو
۲۶	المستشرقون وتعدد زوجات النبی ﷺ	عربی
۲۷	منافذ الحضارۃ الاسلامیہ الی اوروبا قبل عصر النھضۃ	عربی
۲۸	الاسلام والمستشرقون	عربی
۲۹	دینی اور عصری تعلیم وقت کی ایک اہم ضرورت	اردو
۳۰	اسلام امن عالم کا علم بردار اور دہشت گردی کا مخالف	اردو
۳۱	نشریات مدنی	اردو

فہرست مضامین

نشان سلسلہ	مضامین		صفحہ
۱	سخن ہائے گفتنی	ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی	۳
۲	پیش لفظ	ڈاکٹر مظہر محی الدین	۶
۳	تقریظ	ڈاکٹر ثاقب انور ثاقب	۱۰
۴	یادگار تحریریں	نور الحسنین	۱۹
۵	حضرت حسنؓ اور ان کا مثالی کردار		۲۵
۶	مقدس کتابوں کی روشنی میں پڑوسیوں کے حقوق		۳۰
۷	مقدس کتابوں کی روشنی میں حق گوئی		۳۶
۸	عید الفطر محبت و ہمدردی کا درس		۴۳
۹	مقدس کتابوں کی روشنی میں تعلیم کی اہمیت		۴۸
۱۰	ام المومنین حضرت عائشہؓ ایک مثالی خاتون		۵۳
۱۱	شہادت امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ		۵۸
۱۲	روزہ کی طبی اہمیت		۶۵
۱۳	مقدس کتابوں کی روشنی میں پڑوسیوں کے حقوق		۷۱

۱۴	اردو میں سفرنامہ کی روایت	۷۶
۱۵	اے فرش نشیں عرش تیری مسند ہے	۸۳
۱۶	عیدالفطر اخوت اور محبت کا پیغام	۸۹
۱۷	عیدالاضحیٰ ایثار اور قربانی کا درس	۹۴
۱۸	خطوط غالبؔ اپنے عہد کے آئینہ دار ہیں	۹۸
۱۹	دکن میں اردو غزل کا آغاز اور اس کا ارتقاء	۱۰۴
۲۰	مقدس کتابوں کی روشنی میں خواتین کے ساتھ سلوک	۱۱۳
۲۱	فلک پر بھی پہنچی صدائے محمد ﷺ	۱۱۹
۲۲	حضرت حسینؓ کی عظمت کا راز	۱۲۵
۲۳	مقدس کتابوں کی روشنی میں راست گوئی وہ راہ نمائی	۱۳۰
۲۴	حضرت مریم ایک عظیم خاتون	۱۳۴
۲۵	مقدس کتابوں کی روشنی میں معاشرتی اخلاق	۱۴۱
۲۶	کربلا آج بھی درس عمل دیتی ہے	۱۴۵
۲۷	مصنف کی مطبوعہ کتابیں (فہرست)	۱۴۹